تعلیم و تربیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

مغلیہ سلطنت کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اکثر و بیشتر شاہی تقریبات میں جانے کے لیے مولا بخش نامی ہاتھی کی سواری کا استعمال کرتے تھے۔ جب بھی شہنشاہ کو ہاتھی کی سواری کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ حکم نامہ بنام مولا بخش لکھوا کر اپنے خاص ملازم کے ذریعے فیل خانہ بھجوا دیتے جہاں پر ملازم خاص مولا بخش ہاتھی کے پاس کھڑے ہو کر بلند آواز سے بادشاہ کا حکم پڑھ کر سناتا۔ مولا بخش ادب اور خاموشی سے شہنشاہ ہند کا حکم سنتا اور حکم نامے کے ختم ہونے پر سلامی دیتا۔ یہ سلامی مولا بخش کی طرف سے شہنشاہ کے حکم کی تائید کا اعلان ہوتا۔ مولا بخش شاہی حوض میں نہانے کے لیے چلا جاتا۔ اپنے جسم کی خوب صفائی کرتا اور سج دھج کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مولا بخش کی اس خدمت کے معمولات ہمیشہ اسی طرح جاری رہے لیکن 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کر لیا اور مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا تو مولا بخش نے فیل خانے میں کھانا پینا ترک کر کے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ فیل بان کو مولا بخش کے کھانا پینا ترک کرنے کی بڑی فکر اور تشویش ہوئی۔ فیل بان نے مولا بخش کے کھانا پینا چھوڑنے کی اطلاع انگریز حکمرانوں کو دی۔ انگریز حکمرانوں نے مولا بخش کو کھانا کھلانے کے لیے ایک فرنگی عہدیدار کو یہ کام سونپا۔ اس عہدیدار نے کھجوروں اور لڈوؤں سے بھرا ہوا ٹوکرا مولا بخش کے آگے رکھا لیکن ہاتھی نے غصے سے ٹوکرے کو اٹھا کر اس انگریز عہدیدار کو دے مارا۔ فیل خانہ کا انگریز عہدیدار جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور تمام واقعہ اپنے افسران بالا کو رپورٹ کیا۔ انگریز حکمرانوں نے کافی سوچ بچار کے بعد شاہی سواری مولا بخش کی نیلامی کا فیصلہ کیا اور منادی کرا دی۔ دلی کے میدان میں اپنے مقررہ وقت پر نیلامی شروع ہوئی۔ پہلی اور آخری بولی سکہ رائج الوقت کے مطابق دو سو پچاس روپے دلی کے ایک پنساری کے نام ہوئی۔ جونہی بولی ختم ہوئی تو مولا بخش دھڑام سے زمین پر گرا اور اس کی روح جسم کی قید سے پرواز کر گئی۔ اس طرح برصغیر پاک و ہند کی غلامی اور مغلیہ سلطنت کے زوال پر رنجیدہ ہو کر مولا بخش نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے وفاداری پیش کی۔ مولا بخش نے ثابت کیا کہ وفاداری نبھانے سے ہی قدر ہوتی ہے اور اپنوں کے ساتھ کبھی بے وفائی نہیں کرنی چاہیے۔

پیارے بچو! ہمیں یقین ہے کہ آپ گرمیوں کی چھٹیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے ہوں گے کیوں کہ آپ نے پہلے سے چھٹیاں گزارنے کی منصوبہ بندی کر رکھی ہوگی جس سے پڑھائی کے ساتھ وقت بھی اچھا گزرتا ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ آپ رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں سے بھرپور فیض یاب ہوئے ہوں گے۔ اس ماہ کے شروع میں عیدالفطر منائی جائے گی۔ ہماری طرف سے خوشیوں بھری عید کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی ہزاروں لاکھوں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین!

آئندہ شمارے تک اجازت چاہتے ہیں۔ اپنا اور دوسروں کا بہت سا خیال رکھیے گا۔ فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دلچسپ فیچرز اور سلسلے

ایڈیٹر و پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمد باری تعالیٰ

جب نہ تھا نیچے بچھونا فرش کا
سر کے اوپر تھا نہ سایہ عرش کا
جب ہوائیں ، یہ فضائیں کچھ نہ تھا
یہ پرندوں کی صدائیں کچھ نہ تھا
جب یہ سورج چاند تارے بھی نہ تھے
چار سو رنگیں نظارے بھی نہ تھے
نہ گل و گلزار تھے صحرا نہ تھے
باد و باراں بھی ہوئے پیدا نہ تھے
جب نہ تھے پیدا ہوئے حجر و شجر
جب نہ تھا کوئی وجود بحر و بر
جب نہ تھا انسان و حیواں کا وجود
جب نہ تھا کوئی سوال ہست و بود
اس گھڑی موجود تھی ذات خدا
جس نے یہ سب کچھ قمرؔ پیدا کیا

نعت رسول مقبولؐ

دل و جان فدا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
ہر وقت جھکا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
یہ سوچ ہماری ہے یہ دل کی تمنا ہے
ہم خود کو فنا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
اس خالق و مالک کا اتنا تو کرم ہوتا
ہم حمد و ثنا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
آقاؐ ہمیں بھی رکھ لیں اب اپنے غلاموں میں
یہ عرض کیا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
اس جان کے دینے کا اک وقت مقرر ہے
ہر وقت رہا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
دربار الٰہی میں مقبول ضرور ہوتی
گر جا کے دعا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں
بخشش کی سند پھر تو مل جاتی قمرؔ ہم کو
اظہار خطا کرتے سرکارؐ کے قدموں میں

ریاض حسین قمر

پیارے بچو! عید عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے 'جمع ہونے اور لوٹنے کا دن'۔ عید کے دن لوگ عید گاہ میں جمع ہوتے ہیں، روزے مکمل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں۔ نیز یہ دن ہر سال نئی خوشیاں لے کر لوٹتا ہے اس لیے اس کو "عید" کہا جاتا ہے۔ یکم شوال المکرم کے دن عید الفطر اور دس ذی الحجہ کے دن عید الاضحیٰ یا عید قربان منائی جاتی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگ دو دن کھیل کود میں گزارتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ سے دریافت فرمایا: یہ دو دن کیسے ہیں جن میں وہ کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم زمانہ جاہلیت سے ان دو دنوں میں خوشیاں مناتے آرہے ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان دو دنوں سے بہتر دو دن مقرر فرمائے ہیں: ایک عید الفطر، دوسرا عید الاضحیٰ۔ (مسند احمد 13622)

ہر چیز کے کچھ نہ کچھ آداب ہوتے ہیں، عید الفطر جو خوشیوں کا دن ہے اس کے بھی کچھ آداب و احکام ہیں:

☆ غسل کرنا: روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن غسل فرمایا کرتے تھے۔ (ابن ماجہ 1316)

☆ عمدہ لباس پہننا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن خوب صورت اور عمدہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔ اس لیے عید کے دن اپنے پاس موجود کپڑوں میں سے عمدہ لباس پہننا چاہیے۔

☆ خوشبو لگانا: عید کا دن اجتماع کا دن ہے اس میں خوشبو لگانا مسنون ہے تاکہ آپ کے پسینہ سے کسی کو ناگواری نہ ہو۔

☆ عید الفطر کی نماز سے پہلے کھجور یا کوئی میٹھی چیز کھانا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کھجوریں کھائے بغیر عید گاہ تشریف نہ لے جاتے تھے اور ان کی تعداد طاق ہوتی تھی یعنی تین، پانچ، سات وغیرہ۔ (بخاری 953)

☆ عید کی نماز کے لیے جانے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنا۔ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر مقرر فرمایا جو روزہ دار کے روزہ کو فضول اور گندی باتوں سے پاک کرنے والا ہے اور مسکینوں و محتاجوں کی خوراک کا انتظام ہے۔ (ابو داؤد 1609)

☆ صبح سویرے عید گاہ جانا۔

☆ عید گاہ پیدل جانا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم عید کے لیے پیدل تشریف لے جاتے تھے اور پیدل ہی واپس آتے۔ (ابن ماجہ 1294)

☆ ایک راستہ سے عید گاہ جانا اور دوسرے راستے سے واپس آنا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ عید کے لیے ایک راستے سے تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے راستے سے واپس تشریف لاتے تھے۔ (بخاری 986)

☆ تکبیرات کہتے ہوئے جانا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔ عید الفطر میں راستہ میں چلتے ہوئے آہستہ تکبیر کہنا مسنون ہے۔

☆ عید گاہ میں نماز سے پہلے یا بعد میں نفلوں کا پڑھنا منع ہے۔

☆ ہر ایک کے ساتھ خوشی کا اظہار کرنا۔

☆ عید کی نماز کے بعد امام کا خطبہ پڑھنا سنت ہے، خطبہ خاموشی سے سننا چاہیے۔ خطبہ نہ سننا یا اس دوران بات چیت میں مشغول رہنا بُری بات ہے۔

☆ عید الفطر کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ روزہ داروں کے روزہ اور تراویح کو قبول فرماتے ہیں اور ان کے لیے اپنی رضا اور مغفرت کا اعلان فرماتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ عید کے دن روزہ داروں کی دعائیں قبول فرماتے ہیں اور ان کے لیے بخشش کا اعلان فرماتے ہیں۔ (الترغیب والترہیب 1493)

پیارے بچو! عید کی خوشیوں سے لطف اٹھایئے اور اپنے غریب و مسکین بہن بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ عید کی خوشیوں میں شریک رکھیے۔

عید کی خوشیاں

عبدالرشید فاروقی

پارک کے اس حصے میں رنگ رنگ کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ان کی خوش بو سے وہ حصہ مہک رہا تھا۔ خلاف توقع اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا جب کہ پارک کے جھولوں والے حصے میں بہت رش تھا۔ وہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس ہی سکڑا، سمٹا...... ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا گول سا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کی عمر دس سال ہوگی۔ پھولوں میں بیٹھا، وہ کوئی پھول ہی لگ رہا تھا لیکن وہ پھول اس وقت چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے نرم گرم آنسو گالوں سے ہوتے ہوئے گھاس پر گرتے تو وہ بے چین ہو جاتی۔ چھوٹے بڑے پھول اس کے درد کو محسوس کر رہے تھے۔ اس کے درد نے انہیں بھی دکھی سا کر دیا تھا۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ گیندے کے ایک بڑے سے پھول نے اس کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا:

"دوست! میں دیکھ رہا ہوں...... تم کافی دیر سے بیٹھے رو رہے ہو۔ کیا بات ہے...... کیا مجھے بتانا پسند کرو گے۔"

اس نے ننھی سی آواز سنی تو رونا بند کر دیا۔ آواز میں ہمدردی تھی جسے اس نے صاف محسوس کیا تھا۔ دکھ اور تکلیف میں ہمدردی کے دو بول بہت اہم ہوتے ہیں۔ اس نے توجہ کی تو دیکھا...... اس کے بالکل قریب گیندے کا ایک بڑا سا پھول اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔

وہ حیران رہ گیا: "یہ تم ہو پیارے گیندے؟"

"ہاں! یہ میں ہی ہوں...... تم رو کیوں رہے ہو؟"

اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، اس کے کانوں سے ایک اور آواز ٹکرائی: "میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں۔" یہ گلاب تھا۔ سرخ رنگ کا...... زندگی سے بھرپور۔

"دوست! ہم سب بھی تمہارے رونے کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔" بہت سی آوازیں اسے ایک ساتھ سنائی دیں۔

"اوہ...... میں تو سمجھا تھا، یہاں اکیلا ہوں لیکن۔"

"لیکن ہم سب بھی یہاں موجود ہیں۔" موتیا کا پھول، گلاب کے چھوٹے بڑے پھول، گھاس اور کیاریوں میں شان سے کھڑے دوسرے پودوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے دوست؟" گھاس نے اس کے پاؤں میں گدگدی کی۔

"میں نور ہوں......" وہ آہستہ سے بولا۔

"ارے واہ! کتنا پیارا نام ہے تمہارا...... یقیناً تم اپنے امی ابو کی آنکھوں کا نور ہو گے۔" گیندے نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

"امی ابو......" اس کے دل پر چوٹ لگی۔

"کیا ہوا...... کچھ اپنے بارے میں بتاؤ ہمیں۔"

''میں نور ہوں...... اپنے چچا جان کے گھر میں، ان کے ساتھ رہتا ہوں۔''

''چچا جان کے ساتھ، ان کے گھر میں......'' ننھی کلی نے کہا۔

''تم اپنے امی ابو کے ساتھ کیوں نہیں رہتے ہو؟''

''میرے امی ابو نہیں ہیں ناں، اس لیے ان کے ساتھ رہتا ہوں۔''

''کیوں نہیں ہیں...... کہاں گئے وہ؟'' ننھی کلی مسکرائی۔

''ایک سال پہلے دونوں ایک حادثے میں...... اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے۔ چچا، چچی اور ان کے تین بچوں کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔''

''اوہ...... ہمیں معاف کرنا...... ہم نے تمہارا زخم تازہ کر دیا ہے۔'' گلاب نے جلدی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے آنسو پونچھ لیے۔

''لیکن تم رو کیوں رہے تھے؟''

''عید قریب آ رہی ہے...... میرے چچا اور چچی نے فیصلہ کیا ہے، اس بار عید پر میرے لیے نئے کپڑے نہیں بنیں گے۔''

''کیوں...... تمہارے لیے نئے کپڑے کیوں نہیں بنیں گے۔'' ایک چھوٹے سے پودے نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ کہتے ہیں...... اس بار کاروبار ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے بچوں کے کپڑے بن جائیں تو بڑی بات ہے۔'' وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔

''اوہ...... مطلب، وہ اپنے بچوں کے کپڑے تو بنائیں گے، لیکن تمہارے نہیں...... یہ کیا بات ہوئی؟''

''پتا نہیں...... کیا بات ہوئی۔ میرے امی ابو ہمیشہ میرے لیے اچھے اچھے کپڑے بناتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے ہیں ناں...... اس لیے وہ کپڑے نہیں بنا سکتے ہیں۔'' نور نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔

''وہ نہیں بنا سکتے لیکن اللہ جی تو تمہارے لیے کپڑے بنا سکتے ہیں ناں...... تم ان سے کہو...... وہ تمہارے لیے کپڑے بنا دیں گے۔'' گھاس نے چٹکی لی۔

''اللہ جی سے کہوں......! کیا وہ واقعی کپڑے بنا دیں گے۔''

''کیوں نہیں بنائیں گے۔ وہی تو سارے کام کرنے والے ہیں۔ پھر انہوں نے تمہارے ابو امی کو اپنے پاس بلا لیا ہے، کپڑوں کی ذمہ داری تو اب ان کی بنتی ہے ناں...... بس تم ان سے کہو...... مجھے یقین ہے، وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ وہ کسی کو بھی مایوس نہیں کرتے۔ سب کا خیال رکھتے ہیں۔ کوئی اس سے مانگے ہی نہ تو وہ کیا کرے......'' گیندے کا پھول کہتا چلا گیا۔ سب نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

''گیندے انکل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... اللہ جی کیسے کپڑے بنائیں گے...... کیا وہ درزی ہیں؟'' ننھی کلی حیران تھی۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اتنا جانتا ہوں، سب کے سارے کام بس وہی کرتا ہے۔ وہی سب کو روٹی دیتا ہے۔ دکھ اور سکھ اسی کے قبضے میں ہیں۔ جسے چاہتا ہے...... دیتا ہے۔ ایک بزرگ کہہ رہے تھے۔ کبھی کچھ اللہ جی کی طرف سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ کسی سے

نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں...... اللہ جی کو نور کے لیے کپڑے بنانا ہی ہوں گے۔ اب وہ کیسے بنائیں گے...... یہ بات میں نہیں جانتا ہوں۔"

"بزرگ کہہ رہے تھے...... کون سے بزرگ؟" موتیا جلدی سے بولا۔

"ہفتہ پہلے ایک بابا جی یہاں میرے پاس اپنے دو پوتوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھے۔ ان کی باتیں مجھے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ میں نے سب توجہ سے سنیں اور یاد کر لی تھیں۔" گیندے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... مجھے واقعی اللہ جی سے کہنا ہو گا...... کیا میں ابھی کہوں؟" نور خوش ہو گیا۔

"عید تو ابھی دُور ہے۔"

"تم...... تم ابھی اللہ جی سے کہو......" ننھا گلاب بولا۔

نور نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر لیے۔ وہ جانتا تھا، اس کے ابو امی کو جب بھی اللہ جی سے کچھ مانگنا ہوتا تھا تو وہ ہاتھ اُٹھا کر مانگا کرتے تھے...... اس لیے اس نے بھی ہاتھ اُٹھا لیے تھے...... وہ کہہ رہا تھا: "اللہ جی! آپ نے میرے ابو امی کو اپنے پاس کیوں بلا لیا...... ان کے جانے کے بعد میرے چچا کے بیٹے مجھے بہت تنگ کرنے لگے ہیں۔ وہ بات بات پر مجھے مارتے ہیں۔ کھانے کے لیے اچھی چیزیں بھی نہیں دیتے ہیں مجھے۔ ابو امی کے بعد وہ لوگ ہمارے گھر میں رہنے لگے ہیں۔ ہماری ساری چیزوں پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ سب کے سامنے تو مجھے بیٹا کہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں، وہ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتے...... اگر سمجھتے تو مجھے بڑے اسکول سے اُٹھوا کر چھوٹے سے اسکول میں کیوں داخل کرواتے۔ اللہ جی! اب وہ کہتے ہیں...... عید پر وہ اپنے بچوں کے کپڑے تو سلوائیں گے، میرے لیے نہیں لیں گے...... یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔" وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو دیکھا، گیندے کے چھوٹے بڑے پھول، گلاب، موتیے اور سرسبز گھاس...... سبھی اس کی طرف متوجہ تھے۔ وہ دوبارہ کہنے لگا۔

"اللہ جی! انکار مت کیجیے گا...... مجھے دو چیزیں تو ہر حال میں لینی ہیں...... خوش ہو کر دیں یا چچا کی طرح خفا ہو کر۔" وہ کہتے کہتے ایک بار پھر رک گیا۔ درد سے بھرے اس کے الفاظ نے وہاں موجود سبھی کو دکھی کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ وہ قدرے بلند آواز میں کہہ رہا تھا:

"پیارے اللہ جی! وہ دو چیزیں ہیں، نئے کپڑے اور بہت سا پیار...... جب سے ابو امی کو آپ نے اپنے پاس بلایا ہے، کوئی مجھے پیار ہی نہیں کرتا ہے۔ میں ہمیشہ دکھی رہتا ہوں۔ روتا رہتا ہوں...... کوئی میرے آنسو نہیں پونچھتا...... کوئی مجھے چپ نہیں کراتا۔ آپ سب کو سب دیتے ہیں...... مجھے بھی دے دیں۔ اللہ جی! دیں گے ناں مجھے یہ دو چیزیں۔" اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ آنسوؤں سے جیسے بھیگ رہا تھا۔ اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:

"اچھے نور! تمہیں دو چیزیں ضرور ملیں گی۔"

اس نے جلدی سے آنکھیں کھولیں اور اپنے سامنے موجود پھولوں کو دیکھنے لگا۔

"یہ کون بولا تھا...... کیا اللہ جی......؟" سب حیران تھے۔

آواز دوبارہ آئی: "اچھے نور! تمہیں دونوں چیزیں ضرور ملیں گی اور ہمیشہ ملیں گی...... آؤ میرے پاس...... مجھے اللہ جی نے بھیجا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ دونوں چیزیں بہت دی ہیں اور کہا ہے، میں تمہیں دے دوں...... بیٹا! آؤ میرے پاس۔"

نور نے محسوس کیا، آواز اس کے عقب سے آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ وہاں اجلے کپڑوں میں، ایک بزرگ بانہیں پھیلائے، اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ جانے کب سے وہاں موجود تھے۔ وہ یتیم بچوں کے لیے ایک ادارہ چلاتے تھے۔

"دوست! جاؤ...... اللہ جی نے تمہاری دعا سن لی ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے...... سب کی سننا چاہتا ہے، لیکن سنانے والے اسے سناتے ہی نہیں ہیں...... اس سے کہتے ہی نہیں ہیں۔ جاؤ! اللہ جی کی مدد آ پہنچی۔" گیندے کا پھول کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں دکھ، درد تھا اور اب ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی...... ہر کوئی مسکرا رہا تھا۔

نور آہستہ آہستہ بزرگ کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔ وہ بانہیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ دُور...... پارک کے دروازے سے چالیس فٹ دُور ایک مکان کی چھت پر نور کا چچا...... یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ☆☆

وہ ایک سادہ لوح کمہار تھا۔ اس کی زندگی کی کل کمائی ایک گدھا تھا۔ وہ روزانہ صبح سویرے اُٹھتا۔ فجر کی نماز پڑھ کر وہ اپنی گدھا گاڑی تیار کرتا اور گاؤں کے قریب ویرانے کی طرف نکل جاتا تھا۔ یہاں سے وہ اپنی کدال کی مدد سے چکنی مٹی اکھاڑتا تھا اور مٹی سے اپنی ریڑھی بھر لیتا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے وہ گھر لوٹ آتا تھا، تب تک اس کی بیوی ناشتا کر لیتی تھی۔ رات کی باسی روٹی کو تھوڑا گھی لگا کر وہ توے پر سیک دیتی تھی۔ ساتھ اچار اور لسی کا گلاس...... وہ ناشتا کر کے اللہ کا شکر ادا کرتا تھا اور پھر کام پر لگ جاتا تھا۔ گھر کے صحن میں وہ چکنی مٹی کی ''گھانی'' ڈالتا تھا۔ یعنی اپنے پیروں کی مدد سے چکنی مٹی گوندتا تھا۔ جب مٹی تیار ہو جاتی تھی تو وہ مٹی کے برتن اور کھلونے بنانے کے لیے ''اڈے'' پر بیٹھ جاتا تھا۔ یہ ایک گول پہیا تھا۔ اپنے پاؤں کی مدد سے وہ پہیا گھماتا تھا اور چکنی مٹی کا ڈھیلا اس کے ہاتھوں کی کاریگری سے برتن کی شکل لیتا چلا جاتا تھا۔ آگ کی بھٹی اس نے اپنے گھر میں ہی لگا رکھی تھی۔ مٹی کے برتن اور کھلونے وہ اس بھٹی میں پکاتا تھا۔ اگلا مرحلہ پکے رنگ سے نقش و نگار بنانے کا ہوتا تھا۔ جب ''مال'' تیار ہو جاتا تھا تو وہ اپنی گدھا گاڑی پر ہی ''پھیری'' لگانے نکلتا تھا۔

''گھڑے لے لو گھڑے...... اچار ڈالنے کے لیے چاٹیاں...... بچوں کے کھلونے لے لو کھلونے...... گگو...... گھوڑے۔'' یوں زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کمہار اپنی بیوی کے ساتھ دکھ سکھ کی باتیں کرتا تھا۔ ہر رات ہونے والی باتیں تقریباً ایک جیسی ہی ہوتی تھی۔

''رشیداں...... اللہ پاک میری دعا تو سنتا ہی نہیں ہے۔ تم دعا کیا کرو کہ اللہ ہم پر اپنا خاص فضل کر دے۔''

''بخش دین...... تم تو پاگل ہو۔ اللہ نے ہم پر اپنا فضل کر رکھا ہے۔ ہمارے جسمانی اعضاء سلامت ہیں۔ اس نے ہمیں کسی کا محتاج نہیں بنایا۔ ہمیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتا ہے اور کیا چاہیے۔ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔'' بخش دین کی بیوی اسے ہر رات یہی بات سمجھاتی تھی۔

''رشیداں...... تم سمجھتی نہیں ہو۔ زندگی کا تعاقب موت کرتی ہے اور جوانی کا تعاقب بڑھاپا کرتا ہے۔ ہماری تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو کون اپنا سہارا بنے گا۔'' بخش دین بہت گہرائی میں سوچنے لگتا تھا۔ تب رشیداں آہ بھر کر کہتی تھی۔

''اللہ پر بھروسا رکھ...... اللہ پر...... ہم سب کا سہارا وہی تو ہے۔''

ایک دن پھیری لگانے کے بعد بخش دین اپنے گاؤں واپس لوٹ رہا تھا کہ گاؤں کی طرف جانے والے راستے کے چوراہے پر

اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ یہاں بڑے زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ راہ گیر تماشا دیکھنے کے لیے دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ بخش دین نے اپنی گدھا گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور لڑائی کا منظر دیکھنے کے لیے ہجوم میں آ کھڑا ہوا۔ لڑائی دو آدمیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ ایک دُکان دار تھا اور دوسرا ریڑھی والا تھا۔ دونوں ہی پھل فروش تھے۔ ریڑھی پر پھل فروخت کرنے والا دُکان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ دُکان دار کو تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ ریڑھی والے کی موجودگی میں گاہک اس سے خریداری نہیں کریں گے۔ اس لیے اس نے غصے بھرے ریڑھی والے کو کہا تھا۔

''راستہ مت روکو...... اپنی ریڑھی آگے لے جاؤ۔''

''نہیں لے جاتا...... تم کیا کر لو گے؟'' ریڑھی والے کا دماغ بھی گھوم گیا تھا۔ دُکان دار تو اپنی دُکان سے باہر نکل آیا تھا۔ اب وہ دونوں اصیل مرغوں کی مانند ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ چلتے راہ گیر رُک گئے تھے۔ اب وہ اس انتظار میں تھے کہ کون کب کس پر کیسے حملہ کرتا ہے۔

''ریڑھی تو تمہارا باپ بھی یہاں سے آگے بڑھائے گا۔''

''تم مجھے پاگل لگتے ہو۔'' ریڑھی والے نے کہا۔

''تم نے...... تم نے مجھے پاگل کہا۔''

''میں کیا کہنا چاہتا تھا...... ہاں تم ٹھیک سمجھے۔'' دُکان دار کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگا تھا۔

''میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔'' دُکان دار نے اسے دھمکی لگائی تھی۔

''کیا کر لو گے......؟'' ریڑھی والے نے بھی اسے للکارا تھا۔

''میں گدھے کو انسان بنانے کا فن اچھی طرح جانتا ہوں۔'' دُکان دار نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے بس ایک دوسرے کو طعنے دیئے جا رہے تھے۔ ایسے میں ہجوم میں کھڑا ایک آدمی بلند آواز میں بولا۔

''ان دونوں نے دست و گریبان نہیں ہونا۔ بس دل لگی کر رہے ہیں۔ چلو...... چلو اپنے اپنے کام پر چلتے ہیں۔'' لوگ مسکرانے لگے تھے۔ پھر ہجوم چھٹنے لگا۔ پھل فروش ریڑھی والے نے بھی اپنی ریڑھی آگے بڑھا دی تھی۔ بس بخش دین اپنی جگہ پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

''میں گدھے کو انسان بنانے کا فن اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''میں گدھے کو انسان بنانے کا فن اچھی طرح جانتا ہوں۔'' پھر کچھ سوچ کر بخش دین آگے بڑھا۔ وہ دُکان دار کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' دُکان دار ترش لہجے میں بولا تھا۔

''جناب میرا ایک کام کر دیجیے۔ آپ کی مدد میرے لیے جینے مرنے کا سہارا بن جائے گی۔'' بخش دین نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر وہ دُکان دار بھی نرم پڑ گیا تھا۔

''کیا کام ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''جناب میں ایک غریب کمہار ہوں۔ آپ میرے گدھے کو انسان بنا دیجیے آپ گدھے کو انسان بنانے کا فن جانتے ہیں...... آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔'' وہ دُکان دار ایک شاطر آدمی تھا۔ فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ کمہار ایک معصوم اور شریف آدمی ہے۔ اسے دھوکا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور بکرا جب خود ہی چھری تلے آ رہا ہو تو پھر ایک دھوکے باز کو فراڈ کرنے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

''دیکھ بھائی...... اس کام میں بہت محنت لگتی ہے۔ روپے بھی خرچ ہوتے ہیں۔''

''جناب میرے پاس اس وقت بس پانچ سو روپیہ ہی موجود ہے۔ اسی سے گزارہ کر لیجیے۔'' بخش دین نے اپنی جیب میں سے پانچ سو روپیہ نکال لیا تھا۔ اس دھوکے باز نے سوچنے کی اداکاری کی تھی۔

''اخراجات تو زیادہ ہیں۔ مگر تم ایک غریب آدمی ہو۔ چلو کوئی بات نہیں میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔'' اس دھوکے باز نے بخش دین کے ہاتھ سے رقم لے لی تھی۔

''اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ جاؤ اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد آ جانا۔ میں اپنے علم کے زور پر اسے انسان بنا دوں گا۔'' بخش دین تو خوش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا گدھا اس دھوکے باز کے حوالے کیا تھا اور خوشی خوشی گھر واپس لوٹ آیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے شور کرنا شروع کر دیا تھا۔

''رشیداں...... رشیداں...... خوشی کی خبر ہے۔ بنتے بنتے بات بن گئی ہے۔ اب اپنا گدھا انسان بن جائے گا۔ ہم دو آدمی مل کر کام کریں گے اور ہماری تنگ دستی دُور ہو جائے گی۔ اب ہمیں اپنے بڑھاپے کا سہارا مل جائے گا۔'' رشیداں بھی اپنے شوہر جیسی بھولی بھالی تھی۔ ساری کہانی سن کر وہ بھی خوش ہو گئی تھی۔ اب انتظار کے دن شروع ہوئے تھے۔ یہ انتظار بہت تکلیف دہ تھا مگر خدا خدا کر

کے وقت گزر ہی گیا تھا۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد بخش دین صبح سویرے ہی اس دھوکے باز کی دُکان پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں اسے اپنا گدھا نظر نہیں آیا تھا۔ بے چارہ بخش دین کیا جانے۔ اس دھوکے باز نے اسی روز اس کا گدھا فروخت کر دیا تھا۔ بخش دین کو دیکھ کر وہ دھوکے باز مسکرانے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ بخش دین کوئی سوال پوچھتا، وہ دھوکے باز شوخی سے بولا تھا۔

''مبارک ہو جی مبارک...... تمہارا گدھا انسان بن چکا ہے۔''

''کیا...... سچ مچ؟'' بخش دین مسکرانے لگا تھا۔

''اور نہیں تو کیا...... وہ تو میری اُمید سے بھی بڑھ کر عقل مند انسان بنا ہے۔ اس نے بہت کم دنوں میں اتنی تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے کہ میں تو خود حیران ہوں۔'' وہ دھوکے باز حد سے زیادہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

''ویسے وہ اس وقت کہاں پر ہے؟'' بخش دین مسرت سے بولا۔

''اب وہ اس علاقے کا تھانے دار بن چکا ہے۔ اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہوگا۔ اب تو تمہاری موجیں ہیں۔ سب تمہیں جھک کر سلام کریں گے۔ آخر تم اس کے مالک ہو۔''

''مالک نہیں ہوں...... میں نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔'' بخش دین کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئی تھیں۔

''مگر مجھے ڈر بس ایک بات کا ہے کہ کہیں انسان بننے کے بعد وہ تمہیں پہچاننے سے ہی انکار نہ کر دے۔'' دھوکے باز نے فکر مند ہونے کی اداکاری کی تھی۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ آخر ہم نے اتنا وقت ساتھ ساتھ گزارا ہے۔ وہ میری آواز پر لگا ہوا ہے۔ میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لے گا۔'' اب بخش دین پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا تھا۔ دھوکے باز دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

''واقعی اس دُنیا میں بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔'' دھوکے باز کو اپنے اس فراڈ میں کامیابی کا پورا یقین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس کا عملہ اس احمق انسان کو تھانے سے بھگا دے گا۔

بخش دین تھانے پہنچا تو سپاہیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔

''تھانے دار کہاں ہے؟'' بخش دین اکڑ کر بولا تھا۔ اپنے مطابق وہ اپنے گدھے کے متعلق پوچھ رہا تھا اور گدھے کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔

''صاحب جی وہ سامنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔'' سپاہی اس کے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ وہ اکڑ کر چلتا ہوا کمرے کے باہر آ کھڑا ہوا تھا۔ تھانے دار کرسی پر بیٹھا ایک فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بخش دین سوچنے لگا۔

''واہ جی واہ...... میرا گدھا اب پڑھنے لکھنے بھی لگا ہے۔'' پھر اس نے اپنے گدھے کو بلانے کے لیے مخصوص آواز گلے سے نکالی۔

''چچک...... چچک...... چچک۔'' تھانے دار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''چچک...... چچک...... چچک۔'' تھانے دار کو غصہ آ گیا تھا۔ یہ بدتمیزی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ لپک کر بخش دین کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور سخت لہجے میں بولا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اب جو بخش دین نے بات کہی تھی وہ برداشت سے باہر تھی۔

''ذات کا گدھا اور مجھ پر رعب ڈالتا ہے۔ چل میرے ساتھ چل۔'' گدھا کہنے پر تھانے دار کو تو آگ لگ گئی۔ اس نے بخش دین کو ایک دھکا مارا تھا۔ وہ پیچھے گر پڑا تھا۔ تھانے دار نے اسے ایک آدھ ''ٹھڈا'' بھی مار دیا تھا۔ پیچھے سے بخش دین شور مچا رہا تھا۔

''او گدھے...... انسان تو بن گئے ہو مگر دولتیاں مارنے سے

بازنہیں آئے۔" اب غصہ تھانے دار کے سر پر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ وہ سچا تھا۔ یہ اس کی وردی اور عہدے کی توہین تھی۔ دوسری طرف بخش دین بھی سچا تھا۔ وہ تو یہاں بس اپنا گدھا لینے آیا تھا۔ پولیس کے عملے نے مار مار کر اسے گدھا بنا دیا تھا۔ وہ جب اپنے گھر پہنچا تو رشیداں اسے بے حال دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ساری بات سننے کے بعد رشیداں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"بخش دین کبھی تو عقل سے کام لیا کرو۔ بھوکے گدھے نے دولتیاں ہی مارنی تھیں۔ تم اپنے ساتھ "پھک" اور چارہ لے کر جاتے۔ گدھے نے خوش ہو جانا تھا۔"

"یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں۔ گاؤں والے مجھے بدھو کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہیں۔" بخش دین کراہتے ہوئے بولا۔

"تم فکر مت کرو...... کل میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

اگلے دن بخش دین ایک بوری میں "پھک" اور چارہ ڈال کر دوبارہ پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ اب رشیداں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسے دوبارہ دیکھ کر تھانے دار حیران ہوا تھا اور اب کی بار تو ایک خاتون بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں تھانے دار کے کمرے کے باہر آ کھڑے ہوئے تھے۔ تھانے دار اپنی کرسی پر ہی بیٹھا رہا تھا۔ بخش دین کے ساتھ آئی خاتون بہت پیار بھری نظروں سے تھانے دار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بخش دین نے دروازے پر ہی "پھک" اور چارے کا بورا کھول دیا تھا۔ پھر اس نے پیار سے اپنے گدھے یعنی تھانے دار کو پکارا۔ "بچک...... بچک...... بچک......" بخش دین کا خیال تھا کہ اب کی بار تو اس کا گدھا اس سے خوش ہو ہی جائے گا۔

"آ جا بیٹا...... دیکھ اب تو تمہاری ماں بھی تمہیں لینے آئی ہے۔" دوسری طرف تھانے دار بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کچھ اور ہی ہے۔ ذرا سمجھ داری سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا تھا اور بخش دین کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔" اس نے پوچھا تھا۔

"تم میرے گدھے ہو۔ انسان بننے کے بعد تم نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میں تمہارا مالک ہوں۔ میں نے تمہیں اپنے بچوں کی طرح پالا ہے۔ تم ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہو۔ چل بیٹا...... اب گھر چلتے ہیں۔" تھانے دار سمجھ گیا تھا کہ اس معصوم انسان کے ساتھ فراڈ کیا گیا ہے۔

"یہ تو بتایئے کہ مجھے گدھے سے انسان کس نے بنایا۔" تھانے دار اب اس دھوکے باز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جواب میں بخش دین نے تھانے دار کو ساری کہانی سنا دی۔ حیرت سے تھانے دار کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اب مجھے سب یاد آ گیا ہے۔ میں آپ کا گدھا ہوں۔ آپ مجھے اس انسان کے پاس لے چلیں جس نے مجھے گدھے سے انسان بنایا ہے۔ میں اس فن کار کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" بخش دین اور اس کی بیوی تھانے دار کی بات سن کر خوش ہو گئے تھے۔ ان کا گدھا ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو چکا تھا۔ پولیس کا پورا عملہ الرٹ ہو چکا تھا۔ پھر وہ سب پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بخش دین کی نشان دہی پر وہ سب اس دھوکے باز کے پاس پہنچ گئے تھے۔ دھوکے باز بخش دین کے ہمراہ پولیس دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ وہ اپنی پھلوں کی دکان پر بیٹھا گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے آواز لگا رہا تھا۔ گھبراہٹ میں اس کی لے ہی بدل گئی۔ "آلو لے لو...... گوبھی لے لو...... ٹماٹر لے لو۔"

"اچھا تو تم ہو وہ...... جو گدھے کو انسان بنانے کا فن جانتا ہے۔" تھانے دار کے سوال پر دھوکے باز کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔

"نن...... نہیں...... سرکار۔"

"میرا خیال ہے کہ تم انسانوں کو الو بنانے کا فن بھی اچھی طرح جانتے ہو گے۔" "نن...... نہیں...... سرکار۔" تھانے دار نے اس دھوکے باز کو ایک تھپڑ مارا تھا۔ وہ زمین پر گرا تو تھانے دار نے اسے دو ٹھڈے لگا دیے۔

"ہوش کر...... انسان بن...... گدھا نہ بن۔" اب بخش دین چیخا تھا۔ "اپنے محسن کے ساتھ ایسا سلوک مت کرو۔" بخش دین کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"محترم! آپ اپنے گھر جایئے اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ انسان گدھا بن سکتا ہے مگر کبھی کوئی گدھا انسان نہیں بن سکتا۔ رہ گئی آپ کے گدھے کی بات تو وہ آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔" پولیس کے عملے نے تفتیش کی غرض سے اس دھوکے باز کو گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ پھر گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

"واہ او میرے بابا...... گدھا بھی گیا اور گدھے کو انسان بنانے والا بھی گیا۔ گدھا...... گدھا ہی رہے تو اچھا ہے۔ انسان بن کر بہت دکھ دیتا ہے۔" بخش دین اداسی سے بولا تھا۔ وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔

☆☆☆

قدیم زمانے میں لاہور سے دور دراز علاقوں کا سفر گھوڑوں، گدھوں، خچریں، اونٹوں، بیل گاڑیوں اور کشتیوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ انگریزی عہد میں ریلوے لائن بچھائے جانے سے لوگوں کو سستے، تیز رفتار اور آرام دہ سفر کی جدید سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں بلکہ ریل گاڑیوں کے ذریعے رات کا سفر بھی ممکن ہو گیا تھا۔ آزادی کے بعد 75 فی صد لوگ ریل گاڑیوں پر سفر کرتے رہے۔ سامان کی ترسیل بھی مال گاڑیوں کے ذریعے ہوتی رہی تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد لاہور ریلوے اسٹیشن پر مشہور سیاسی و مذہبی رہنماؤں کا بھرپور استقبال کیا جاتا رہا۔ انگریز اور ہندوستانی حاکم بھی اپنے اسپیشل سیلون کے ذریعے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے رہے ہیں۔

پُرانے دور کے ادب اور فلموں میں بھی لاہور ریلوے اسٹیشن کی جھلک ملتی ہے۔ پچاس کی دہائی میں اس ریلوے اسٹیشن پر معروف انگریزی ناول نگار جان ماسٹرز کے ناول بھوانی جنکشن پر بننے والی ہالی ووڈ فلم کے کچھ حصے فلمائے گئے جس کے لیے امریکی اداکارہ ایوا گارڈ خصوصی طور پر لاہور آئیں اور لاہور ریلوے اسٹیشن میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ بھارت اور پاکستان میں بننے والی کئی فلموں کے بہت سے مناظر بھی یہاں فلمائے گئے۔ برصغیر میں تحقیق ہونے والے ادب میں جہاں ریل گاڑی کے سفر کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، وہاں لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا تذکرہ بھی کئی بار ہوا۔ سرت چندر چیٹر جی کے مشہور ناول "دیوداس" جس کا ہیرو آخر میں ریل گاڑی کا طویل سفر کرتا ہے، ان میں مختلف ریلوے اسٹیشنوں میں لاہور کا ریلوے اسٹیشن بھی شامل ہے۔

برصغیر کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی ترقی کا ذکر لاہور کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ترقی میں جہاں اور بہت سے اداروں نے اپنا کردار ادا کیا، وہیں ریلوے اسٹیشن لاہور کا کردار بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ریلوے اسٹیشن صرف ٹرینوں کے سٹاپ یا جنکشن کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ تاریخ میں بھی ایک اہم حوالہ تصور کیا جاتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن لاہور نہ صرف پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے بلکہ براعظم ایشیاء کے خوب صورت ترین ریلوے اسٹیشنوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ دلی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر واقع ہے۔ شاہی قلعہ سے اس کا فاصلہ دو کلومیٹر ہے۔

1940ء آل انڈیا مسلم لیگ کے منٹو پارک میں منعقد ہونے والے جلسے میں شرکت کے لیے جب قائداعظم محمد علی جناحؒ لاہور پہنچے تو اسی ریلوے اسٹیشن لاہور پر ان کا فقید المثال استقبال ہوا پھر 1947ء میں تقسیم ہند کے وقت مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کی سب سے زیادہ تعداد اسی ریلوے اسٹیشن کے ذریعے پاکستان پہنچی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے اواخر میں اس ریلوے اسٹیشن کو بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور فروری 1859ء میں لارڈ جان لارنس نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کا یہ پہلا باقاعدہ منصوبہ تھا۔ برطانوی ماہر تعمیرات ولیم برنٹن کے تیار کردہ

نقشے پر تعمیراتی کام کی ذمہ داری ٹھیکے دار میاں محمد سلطان چغتائی کو سونپی گئی جنہوں نے 5 لاکھ روپے کی لاگت سے یہ قلعہ نما عمارت ایک سال میں مکمل کر دی۔ یوں جنوبی ایشیا، میں برطانیہ سرکار نے ریل سروس کی داغ بیل ڈالی۔

1859-60ء کے دوران تعمیر کی گئی اس عمارت میں بڑے برج، چھوٹی برجیاں اور فصیلیں بھی بنائی گئی تھیں۔ ان فصیلوں میں سکیورٹی گارڈ کے لیے رائفلوں کے سوراخ بھی رکھے گئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے پانچ بالائی پل بھی بنائے گئے تھے جن میں سے تین پل مسافر ریلوے لائنوں کو پار کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے تھے جب کہ چوتھا پل ریلوے ملازمین کو ورک شاپ پہنچاتا تھا۔ پانچواں پل گڑھی شاہو اور مغل پورہ کو ملاتا ہے۔ پہلے ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں دو گیٹ بھی لگائے گئے تھے جو رات کے وقت بند کر دیئے جاتے تھے۔

ہندوستان میں برطانوی راج کے دوران لاہور ریلوے اسٹیشن فن تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ اس عمارت کا نقشہ بناتے وقت مسافروں کے ساتھ ساتھ مال برداری کی ضروریات کے علاوہ خاص حالات میں جنگی اور دفاعی ضرورت کو بھی مدنظر رکھا گیا اور اسے قلعہ کے انداز میں تعمیر کیا گیا اور پھر اس مقصد کے لیے یہ عمارت استعمال بھی کی گئی۔ اسٹیشن کی عمارت اس قدر مضبوط بنائی گئی کہ توپ کے گولے بھی اس پر اثر نہیں کرتے تھے۔

لاہور سے امرتسر اور پھر ملتان تک ریلوے پٹڑی ولیم برنٹن کی نگرانی میں ہی بچھائی گئی تھی جب کہ اس کے بھائی جان برنٹن کی زیر نگرانی کراچی اور کوٹری کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی تھی۔ لاہور سے امرتسر اور ملتان تک ریلوے پٹڑی بچھانے کے لیے ٹھیکے پی ڈبلیو ڈی کے درجن بھر ٹھیکیداروں کو دیئے گئے تھے جن میں لالہ میلا رام، چھوٹے لال، جمنا داس، دیوناتھ، پریم سنگھ، حکم سنگھ، مسٹر کورنس، طر برطون، عمر دین اور محمد سلطان چغتائی شامل تھے۔

لاہور سے امرتسر تک 32 میل لمبی ریلوے لائن بچھانے کا کام دسمبر 1861ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ 10 اپریل 1862ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن سے پہلی ٹرین مسافروں کو لے کر امرتسر پہنچی۔ 1878ء میں افغانوں کے ساتھ انگریزوں کی دوسری لڑائی کے دوران فوجی دستے اور جنگی ساز و سامان میدان جنگ بھجوانے کے لیے اس اسٹیشن کا خصوصی طور پر استعمال کیا گیا۔ ایک ریکارڈ کے مطابق اس وقت 24 گھنٹوں میں اسٹیشن سے گزرنے والی ٹرینوں کی تعداد 75 تھی۔ اس عمارت میں تعمیر کیے گئے بڑے کمروں اور گوداموں میں افغانستان سے لوٹا گیا مال رکھا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کی آمدورفت میں بھی لاہور ریلوے اسٹیشن کا کلیدی کردار رہا۔ پاک بھارت جنگوں میں بھی دفاع میں اس اسٹیشن نے اہم کردار ادا کیا۔

تعمیر کے وقت ریلوے اسٹیشن کی عمارت شہر سے باہر تھی۔ اس اسٹیشن پر بیک وقت 12 پلیٹ فارموں پر 12 ٹرینیں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم تک جانے کے لیے خصوصی طور پر مضبوط آہنی پل بنائے گئے تھے جو مشرقی اور مغربی شہر کو ملانے کے لیے رابطہ اور راستہ تھا۔

ریلوے اسٹیشن کی تعمیر کے وقت مسافروں کے آرام و طعام کا خاص خیال رکھا گیا۔ یہاں ریستوران بنائے گئے جو مسافروں کے ساتھ ساتھ شہر کے لوگوں کے لیے بھی کشش رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام شہری ہوٹلوں میں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ اب یہ ریستوران موجود نہیں۔ انگریز دور میں پلیٹ فارم نمبر2، 4، 5 پر درجہ اوّل، درجہ دوئم کی انتظار گاہیں بھی بنائی گئی تھیں مگر اس وقت صرف ایک انتظار گاہ پلیٹ فارم نمبر4 پر موجود ہے۔ شمال مغربی جانب ''نارووال مسافر خانہ'' کے نام سے پہچان رکھنے والا مسافر بھی بنایا گیا تھا جو ختم کر دیا گیا۔ اسی طرح جنوب مغربی جانب ''کراچی مسافر خانہ'' بھی اب اپنی شکل تبدیل کر چکا ہے جسے نئے انداز میں بنایا گیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کا مرکزی داخلی راستہ اور کراچی مسافر خانہ پہلے سے زیادہ مصروف ہے جس کی بنیادی وجہ شمال اور جنوب میں واقع مسافر خانوں کی مسماری ہے۔ بنیادی طور پر اب ریلوے اسٹیشن لاہور کی عمارت کا 20 فی صد سے زائد حصہ اپنی اصل حالت کھو چکا ہے اور اس میں چند تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ پلیٹ فارموں پر انگریز دور کے نصب کردہ واٹر کولر بھی اب ختم ہو چکے ہیں۔ ان کی جگہ اب نئے واٹر کولر لگائے گئے ہیں مگر ان میں سے بھی زیادہ تر بند ہی ہوتے ہیں۔ انگریز دور میں ہر پلیٹ فارم کے اوپر جستی چادروں کی چھتیں ڈالی گئی تھیں تاکہ مسافر دھوپ اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ چھتیں آج بھی قائم ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ مسافروں کو ٹرینوں کی آمدورفت سے آگاہ کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر بڑی تعداد میں لاؤڈ اسپیکر نصب کیے گئے ہیں۔

لاہور ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم نمبر1 بیس فٹ چوڑا اور

500 فٹ لمبا بنایا گیا تھا۔ بعدازاں مزید 10 پلیٹ فارم بنائے گئے۔ ان گیارہ پلیٹ فارموں پر فوڈ اسٹالز، ڈرنک کارنرز اور بک سٹالز کے علاوہ میکڈونلڈ اور پیزا ہٹ کی برانچز بھی پائی جاتی ہیں۔ لاہور سٹی اور کینٹ اسٹیشن کے بعد راوی کی طرف بادامی باغ کا چھوٹا ریلوے اسٹیشن بنایا گیا تھا جسے زیادہ تر مال بردار گاڑیوں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ راوی پار پہلا ریلوے اسٹیشن شاہدرہ میں بنایا گیا تھا جو بعدازاں بلدیہ لاہور کی حدود میں آگیا تھا۔ کینٹ کی طرف مغل پورہ کا ریلوے اسٹیشن اور ریلوے ورک شاپ بھی تعمیر کی گئی تھی۔

ریلوے اسٹیشن کو باہر سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اسٹیشن کی عمارت پر متعدد مینار بنائے گئے ہیں۔ عمارت کے وسط میں ایک بڑا برآمدہ بنایا گیا ہے جو باہر کی طرف نکلا ہوا ہے۔ اسٹیشن کی چھت پر عین وسط میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ دونوں میناروں پر چاروں جانب کلاک نصب کیے گئے ہیں۔ دونوں میناروں کے درمیان جلی حروف میں لکھا ہوا کلمہ طیبہ انتہائی دیدہ زیب منظر پیش کرتا ہے۔ اسٹیشن کے برآمدے کے اندر ٹکٹ خریدنے کے لیے کھڑکیاں ہیں جب کہ اس کی دیواروں پر گاڑیوں کے ٹائم ٹیبل آویزاں کیے گئے ہیں۔ برآمدے کے اندر سے پلیٹ فارم نمبر 1 اور 2 پر جانے کے لیے پیدل راستہ ہے جب کہ دیگر پلیٹ فارموں پر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی برآمدے کے اندر سے ہی جاتی ہیں۔

اسٹیشن کی عمارت کے شمالی برج کے سامنے پرانے ماڈل کا ایک اسٹیم انجن نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہ انجن 1932ء سے برطانوی راج کے زیر استعمال تھا۔ ڈیزل انجن آنے کے بعد سٹیم انجن مرحلہ وار ختم کر دیے گئے۔

اسٹیشن کے سامنے ایک باغیچہ بنایا گیا تھا۔ آغاز میں یہ باغیچہ کافی بڑا تھا تاہم سڑکوں کی توسیع کی غرض سے چھوٹا کر دیا گیا ہے۔ باغیچے کے بائیں جانب ایک فوارہ بنایا گیا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں شام کے وقت اس فوارے کے نیچے شہریوں کی بڑی تعداد بیٹھی نظر آتی ہے۔ باغیچے کے دائیں جانب ایک بڑی مسجد واقع ہے۔ آسٹریلیا مسجد کے نام سے مشہور یہ مسجد 1930ء میں آسٹریلیا میں مقیم پاکستانی تاجر نے تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد میں پاکستان کے متعدد بڑے سیاسی اور مذہبی رہنما نماز ادا کر چکے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی 1941ء میں اس مسجد میں نماز ادا کر چکے ہیں۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ قائداعظم مسجد آسٹریلیا میں نماز پڑھنے گئے تو نمازیوں کی بڑی تعداد کی وجہ سے قائداعظم پچھلی صف میں بیٹھ گئے جس پر نمازیوں نے اگلی صف میں جانے کے لیے راستہ بنایا اور آگے جانے کا کہا۔ اس پر قائداعظم نے کہا کہ اگلی صفوں پر ان کا حق ہے جو پہلے آئے ہیں۔

4 سے 5 مربع کلومیٹر تک پھیلے ہوئے اس ریلوے اسٹیشن پر مغل پورہ میں گاڑیوں کی مرمت کے لیے 1908ء میں پہلی ورک شاپ تعمیر کی گئی جسے ریلوے کیرج اینڈ ویگن شاپ کہتے ہیں۔

لاہور ریلوے اسٹیشن کی تعمیر میں استعمال کیے گئے سامان کی پائیداری اور مضبوطی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 160 سال گزر جانے کے باوجود یہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک لاہور ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں باسوائے پلیٹ فارموں پر پتھر لگانے اور اسٹیشن سے متصل بیرونی جانب ایک عمارت کی تعمیر کے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

☆☆☆

پہاڑ کیسے بنے؟

زمین کے وہ حصے جو سمندر کی سطح سے تین ہزار فٹ سے زیادہ اونچے ہیں، پہاڑ کہلاتے ہیں۔ بعض پہاڑ ہماری زمین کے ساتھ ہی وجود میں آئے، یعنی کروڑوں سال پہلے جب زمین بنی تو اس پر بعض مقامات پر ٹیلے سے بن گئے جو رفتہ رفتہ بلند ہوتے گئے۔ بعض پہاڑ زمین بننے کے بہت عرصے بعد بنے۔ یہ ان چٹانوں سے بنے ہیں جو زمین کے اندر تھیں۔ جب یہ چٹانیں زمین کی حرارت سے پگھلیں تو ان کا لاوا زمین کا پوست (چھلکا) پھاڑ کر اوپر آ گیا اور پھر ٹھنڈا ہو کر پہاڑ بن گیا۔

پہاڑوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ نہ گھٹتے ہیں، نہ بڑھتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ پہاڑوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں لیکن ان تبدیلیوں کا عرصہ اتنا لمبا ہوتا ہے کہ ہم ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

دُنیا کے بعض پہاڑوں کی بلندی کم ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی چوٹیوں پر برف گرتی اور پھر پگھلتی ہے، جس سے چٹانیں گھستی اور ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہیں۔ جب پگھلی ہوئی برف کا پانی بہہ کر نیچے ندی نالوں میں جاتا ہے تو اپنے ساتھ چٹانوں کے ٹوٹے ہوئے پتھروں اور ذروں کو بھی بہا کر لے جاتا ہے۔ اس سے پہاڑ کی بلندی کم ہو جاتی ہے۔

بعض پہاڑ اُونچے ہو رہے ہیں۔ ایسے پہاڑ زیادہ تر آتش فشاں (جوالا مکھی) ہیں۔ جب ان کے نیچے کا لاوا اُبل کر باہر نکلتا ہے تو اس سے ان کی بلندی زیادہ ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں کوئی آتش فشاں پہاڑ نہیں ہے۔ لندن (برطانیہ) اور نیویارک (امریکا) کے قریب بھی کوئی آتش فشاں پہاڑ نہیں ہے اور نہ آئندہ کبھی ہونے کی اُمید ہے لیکن دُنیا کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں قریب قریب کئی آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ وسطی امریکہ کا وہ علاقہ جو بحرالکاہل کے نزدیک ہے، وہاں سب سے زیادہ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ ویسے بحرالکاہل کے چاروں طرف بھی بہت سے آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ ان میں سے کچھ مردہ یعنی ٹھنڈے ہو چکے ہیں اور کچھ اب بھی زندہ ہیں اور پھٹتے رہتے ہیں۔

بحرالکاہل کے آس پاس آتش فشاں پہاڑ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سمندر کے چاروں طرف زمین کا پوست کم زور ہے اور اب تک پختہ نہیں ہوا ہے۔ (دوسرے علاقوں کی زمین کا پوست پختہ ہو چکا ہے۔) آتش فشاں اس جگہ بنتے ہیں جہاں زمین کا پوست کم زور ہوتا ہے اور زمین کے اندر کی پگھلی ہوئی چٹانیں یعنی لاوا اسے توڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ جہاں زمین کا پوست پختہ اور مضبوط ہوتا ہے، وہاں آتش فشاں نہیں بنتے۔

☆☆☆

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی

اَلْمَانِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ (روکنے والا)

اَلْمَانِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ حفاظت کی چیزیں پیدا کر کے نقصان پہنچنے سے روکتا ہے۔

تشریح: نقصان کبھی دین میں ہوتا ہے اور کبھی جسموں میں۔

دین میں نقصان یوں ہوتا ہے جیسے جھوٹ بولنا...... دھوکہ دینا...... حسد کرنا...... کسی کو تکلیف پہنچانا...... رشوت لینا اور دینا...... یہ سب چیزیں ہمارے دین کو بھی نقصان دینے والی ہیں اور ہماری دُنیا بھی بگاڑنے والی ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے ہمیں روک دیا۔

ایسے ہی اس نے گندم کو چاول بننے سے روکا ہوا ہے۔ انسان کو جانور بننے سے روکا ہوا ہے۔ پرندہ ہوا میں اُڑ رہا ہے اس کو فضا میں اسی نے روکا ہوا ہے۔ جہاز ہوا میں اُڑ رہے ہیں انہیں گرنے سے روکا ہوا ہے۔ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے۔

نادان کافر

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رسول اکرم ﷺ سفر سے تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ آرام فرمانے کے لیے رُکے۔ ایک درخت کے نیچے آپؐ اکیلے ہی سو گئے۔ اس وقت کوئی صحابی قریب نہ تھے۔ کسی کافر نے آپؐ کو اکیلے دیکھا تو تلوار لے کر آ گیا اور بالکل آپؐ کے سر مبارک پر آ کھڑا ہوا۔ آپؐ کی آنکھ کھلی تو آپؐ نے دیکھا کہ اس کافر کے ہاتھ میں تلوار ہے اور آپؐ کو نعوذ باللہ نقصان پہنچانا چاہتا ہے وہ کافر کہنے لگا:

"اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟"

اس کافر کا یہ خیال تھا کہ تلوار دیکھ کر آپؐ گھبرا جائیں گے اور پریشان ہو جائیں گے لیکن آپؐ کے چہرے مبارک پر مکمل اطمینان تھا۔ آپؐ نے اطمینان سے جواب دیا کہ "اللہ" یعنی مجھے اللہ تعالیٰ بچائیں گے۔ یہ سننا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کافر پر خوف طاری کر دیا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگ گئے اور اس کافر کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر پڑی۔ اب وہ تلوار آپؐ نے اپنے ہاتھ میں اُٹھالی اور فرمایا کہ: "اب تم بتاؤ کہ تمہیں کون بچائے گا؟"

وہ کافر نہیں جانتا تھا کہ مشکل حالات میں اور نقصان پہنچانے سے روکنے والا اللہ ہے۔ اس لیے وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ آپؐ نے اس کافر کو معاف فرما دیا۔

فرض نماز کے بعد

آپؐ ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ.

ترجمہ: اے اللہ! جو نعمت آپ دے دیں پھر اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو آپ روک لیں پھر اس کا کوئی دینے والا نہیں۔" ☆☆

یتیم ہوں مجبور نہیں

ساجد، جھنگ

''السلام علیکم......'' میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ آواز سے چونک کر اوپر دیکھا تو خوشی کی انتہا نہ رہی میرا دیرینہ دوست میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں خوشی سے بے ساختہ انداز میں اس سے ملا۔ وہ بھی بہت خوش تھا۔ ہم نے بہت دیر تک آپس میں باتیں کیں اور باتوں میں وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا اور مغرب کا وقت ہو گیا۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد میں اپنے دوست اسد کو اپنے ساتھ ہی گھر لے آیا۔

اسد، اسلام آباد سے آیا تھا اور ادھر لاہور میں اپنے کسی رشتے دار کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا اور اسے رات کو اپنے گھر ہی روک لیا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم چائے پی رہے تھے کہ اسد بولا۔ ''یار ماشا اللہ! تمہاری دُکان اور گھر تو بڑا اچھا سیٹ ہیں۔ لگتا ہے انکل نے بڑی رقم دی ہے تمہیں کاروبار کے لیے......'' میں محض مسکرایا اور ہاں میں سر ہلایا۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' میں نے اسد سے پوچھا۔

''میں......؟ دھکے کھا رہا ہوں۔'' وہ کچھ اداسی سے اور کچھ طنزیہ انداز میں بولا۔

''دھکے......؟ کیوں......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس یار، جس کے پاس پیسہ ہو یا پیچھے کوئی لگانے والا ہو اسی کا کچھ بنتا ہے۔ ہم جیسوں کو کون پوچھتا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' میں اس کی باتوں سے حیران تھا۔

''ہم جیسوں سے کیا مطلب؟ یار میرے والد کو فوت ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔ میٹرک کے امتحان کے بعد میرے والد فوت ہو گئے تھے۔ تب سے محنت مزدوری کر کے اور کچھ رشتہ داروں کی مدد سے گھر کا پورا پورا خرچہ چلتا ہے۔ اب مشکل سے اپنی پڑھائی مکمل کی ہے۔ ہم م م م......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

میں ابھی بولنے ہی والا تھا کہ وہ دوبارہ بولنے لگا۔

''تم خوش قسمت ہو یار! تمہارے ابو ہیں جنھوں نے تمہیں اتنا پیسہ دیا کہ تم اپنا کاروبار کر سکو۔ ایک مجھے دیکھو، اتنی محنت کرتا ہوں اور پھر بھی دھکے کھا رہا ہوں۔''

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جس پر میرے لیے رشک اور اپنے لیے رحم موجود تھا۔

''اب یہاں کام ڈھونڈنے آئے ہو؟'' میں نے کچھ توقف سے پوچھا۔ ''ہاں! میرے چچا کی فیکٹری ہے یہاں...... ان کو ملازم کی ضرورت تھی اور اب دس ہزار روپے میں ایم فل فزکس کر کے وہاں نوکری کروں گا۔'' ''تم نے فزکس میں ایم فل کیا ہے؟'' میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں یار......''

''تو تم کوئی اچھی نوکری ڈھونڈو...... فزکس والوں کو تو دُنیا ڈھونڈتی ہے۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اچھی نوکری کے لیے رشوت کی ضرورت ہوتی ہے یا سفارش کی...... اور میرے پاس دونوں چیزیں نہیں ہیں۔''

''تو کب سے جانا ہے اس فیکٹری میں......؟''

"اگلے ہفتے...... چچا کسی کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں، وہ آئیں گے تو کام شروع ہوگا۔"

ٹھیک ہے...... تب تک تم میرے پاس ہی رہو گے۔" میں نے کچھ سوچ کر حتمی لہجے میں کہا۔

نہیں یار...... اچھا نہیں لگتا۔ چچا کا گھر ہے ناں...... بس وہیں رہوں گا۔ ملنے آیا کروں گا تمہیں۔"

"نہیں...... بس میں نے کہہ دیا ناں...... تم کہیں نہیں جا رہے...... ادھر ہی میرے پاس رہو گے تم!" میں نے حتمی لہجے میں کہا، آخر وہ مان گیا۔ ہم نے عشاء کی نماز پڑھی اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ......☆......

ناشتہ کر کے اب ہم جانے کے لیے تیار تھے۔ گاڑی میں بیٹھے اور نکل گئے۔

"کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا شوروم ادھر تو نہیں ہے......"

"ہاں! میں تمہیں کہیں اور لے کر جا رہا ہوں۔"

"کہاں......؟"

"بتاتا ہوں، صبر کرو...... کچھ دکھانا ہے تمہیں۔"

"پر کہاں لے آئے ہو؟" اسد نے حیرانی سے پوچھا۔ "اتنا کچرا۔"

"آؤ میرے ساتھ......" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اسد حیران تھا کہ ان گلیوں میں کیا کام۔ "یار یہ اتنی تنگ گلیاں...... کچرا...... گندا پانی...... جا کہاں رہے ہو......؟"

اس کے سوال کرتے کرتے میں اسے ایک گھر تک لے کر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا، میں اسد کو لے کر اندر چلا گیا۔ اندر بہت سارے لوگ بیٹھے کپڑے تہہ لگا کر شاپر میں ڈال رہے تھے۔ ایک پنکھا جو بمشکل صرف ہُر ہلا رہا تھا مگر سب اپنے کام میں مگن تھے۔

"السلام علیکم......" میں نے باآواز بلند کہا تو سب متوجہ ہو گئے اور سب نے خوشی سے میرے سلام کا جواب دیا۔

"یہ میرا دوست ہے اسد......" میں نے تعارف کروایا۔

"ایسے ہی یہاں سے گزر رہے تھے تو ادھر ملنے آ گیا۔" میں نے وضاحت کی۔

"بابا جی کہاں ہیں......؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر......" ایک بندے نے اشارے سے بتایا۔

بابا جی کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ پُرتپاک انداز میں میں نے اس کو بھی ان سے ملوایا۔

"یہ ہیں میرے پہلے باس......" میں نے اسد کو بتایا۔

"کیا مطلب......؟" وہ حیران ہوا۔

"میں نے اپنا کام یہاں سے شروع کیا۔ انہوں نے مجھے کاروبار کے سارے گُر سکھائے ہیں اور آج میں جس مقام پر ہوں وہ انہی کی وجہ سے ہوں۔"

اسد حیرانی سے کبھی مجھے اور کبھی بابا جی اور اس تنگ گھر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم واپسی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہی تنگ گلیوں اور کچروں کو پھلانگتے ہوئے واپس آ گئے۔

"یار تم یہاں کیوں کام کرتے تھے؟" اسد نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا تمہاری لڑائی ہو گئی تھی گھر والوں سے؟" اس نے اگلا سوال پوچھا۔ "نہیں تو......" میں نے یک دم جواب دیا۔

"پھر یہاں اس ماحول میں...... تمہارا تعلق اچھے کھاتے پیتے خاندان سے ہے...... تو پھر...... تم اپنے ابو سے ناراض ہو گئے ہو گے نا...... چلو تمہارے اس طرح کرنے سے انہوں نے تمہیں کاروبار تو سیٹ کر دیا ناں...... باپ سر پر ہو تو بندہ اکڑ بھی لیتا ہے اور کچھ منوا بھی لیتا ہے...... میں کسی سے ناراض بھی ہو جاؤں تو کسی کو کیا فرق پڑے گا...... نہ مجھے منانے والا کوئی اور نہ کوئی ضد ماننے والا...... خوش قسمت ہو تم یار......"

اسد میری کوئی بات سنے بغیر ہی مسلسل بولے جا رہا تھا اور میں اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات دیکھتا رہا۔ ......☆......

"یار علی تمہارے ابو کدھر ہیں؟" اسد نے ناشتا کرتے ہوئے اچانک پوچھا۔ "مجھے چار دن ہو گئے ہیں یہاں آئے ہوئے مگر ان کو نہیں دیکھا، کہیں کام سے گئے ہوئے ہیں کیا......؟"

"نہیں باہر تو نہیں گئے ہوئے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو ملواؤ نہ ان سے......" اسد بے نیازی سے بولا۔

"ہاں! ضرور ملواتا...... مگر ملوا نہیں سکتا۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں؟" اب اس نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ...... میرے ابو بھی فوت ہو گئے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا......؟" وہ اچھل گیا۔ "کب؟ کیسے؟ تم نے اتنے دنوں سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔"

"ہاں بس...... فرسٹ ایئر میں تھا جب ان کا انتقال ہوا تھا۔"

"اوہ...... افسوس ہوا سن کر۔"

"چلو ان کی جائیداد اور کاروبار تو تم لوگوں کے کام آیا۔" اسد آہستہ سے بولا۔

"نہیں اسد....." میں نے اس کی بات پہلی بار کاٹی تھی۔ "جب ہمارے ابو فوت ہوئے تو ہمارے پاس سوائے اس مکان کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ رشتہ داروں نے بھی آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ دیا۔ میں پری میڈیکل میں تھا اور ڈاکٹر بنانا میرے ابو کا خواب تھا مگر اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں میڈیکل میں داخلہ لے سکتا۔

مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے، جب میں تقریباً ہمت ہار چکا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اسی دوران ہمارے چچا ہمارے گھر آئے، انہوں نے مجھے کچھ پیسے دینا چاہے۔ میں نے پیسے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ امی نے روک دیا۔

چچا نے بہت کہا کہ رکھ لیں مگر امی نے کہا کہ آپ ہماری خودداری کا مذاق نہ بنائیں اور پیسے واپس لے جائیں۔

چچا تو واپس چلے گئے مگر میں امی سے تھوڑا سا ناراض ہوا کہ لے لیتیں پیسے۔ گھر میں راشن ختم ہونے والا ہے، وہی آ جاتا۔

تب امی نے بہت پیار سے مجھے پاس بٹھایا اور کہا۔

"ایک دفعہ ہمارا پیٹ کسی اور کے پیسوں سے بھر گیا تو ہمارے ہاتھ محنت سے کمانے میں کمزور پڑ جائیں گے۔ آج ہم بھوکے ہیں تو ہمارے ہاتھ محنت سے کبھی نہیں گھبرائیں گے اور وہی سکون بھی لے گا۔"

امی کی اتنی بات سے مجھے اپنے آپ پر شرمندگی ہوئی اور میں نے اسی وقت ٹھان لیا کہ محنت کر کے کماؤں گا اور کسی کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا اور وہ جو گھر تمہیں دکھایا تھا ناں..... وہاں تین سال تک میں نے کام کیا۔ بہت محنت کی، روابط بڑھائے اور آج میں اس مقام پر ہوں جہاں تم دیکھ رہے ہو۔"

اسد خاموشی اور حیرانگی سے میری ساری بات سنتا گیا۔ میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ میرے ہاتھ لینے والے نہیں بلکہ دینے والے ہیں۔ میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ میں ڈاکٹر تو نہیں بن سکا مگر اپنے باپ کی خودداری کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔

میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ میں یتیم ہوں مگر مجبور نہیں۔"

اسد ابھی تک خاموش تھا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اپنے آپ کا احتساب کر رہا ہو۔

میں نے ہلکے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں اس لیے اپنے پاس روکا تھا کہ تمہیں کسی طرح سمجھا سکوں۔ تم خود اپنے آپ پر ترس کھاؤ گے تو دنیا بھی تم پر صرف ترس کھانے کی لیکن اگر تم محنت کرو گے تو اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا۔ اپنے آپ کو بے چارگی کی کیفیت سے باہر نکالو۔"

اسد نے بتایا "آج ایک کمپنی والوں نے بلایا ہوا ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن تم نے مجھے پہلے تو نہیں بتایا۔" میں نے خفگی سے پوچھا۔

"ہاں پہلے نہیں بتایا تھا..... پہلے میرا یہی خیال تھا کہ سفارش کے بغیر مجھے کون نوکری دے گا مگر آج تمہیں دیکھ کر احساس ہو گیا کہ میں یتیم ہوں مگر مجبور نہیں۔ میرا کام محنت کرنا ہے، آگے اللہ کو جو منظور......"

ہم دونوں ہی ہنس دیے..... میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا..... اور آج ایک اور یتیم اپنے رزقِ حلال کے لیے جدوجہد کرنے چلا تھا۔

☆☆☆

وہ لڑکا تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جب کہ اس کے پیچھے دو افراد آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان بھی تیس میٹر کا فاصلہ قائم ہو چکا تھا۔ حجام بہ ظاہر تو ہانپ رہا تھا لیکن پھر بھی دوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ایک نوجوان نے لڑکے کے ہاتھ میں مشکوک بیگ دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کچھ چوری کر کے بھاگ رہا ہے، اس لیے وہ اسے پکڑنے کے لیے جان کی بازی بھی لگانے کو تیار ہو گیا۔

''ارے بھائی! اسے روکنا۔'' حجام نے پیچھے سے آواز سنی تھی۔ اس نے پہلے بھاگتے لڑکے کو دیکھا، پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان اس لڑکے کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اُسی نے حجام کو پکارا تھا۔

''ابے رُک! کہاں بھاگ رہا ہے؟'' حجام نے جب مدد کے لیے آواز سنی تو بھاگتے لڑکے سے گرج دار آواز میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اسے پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی تھی۔ اِدھر اس نے لڑکے کی جانب رُخ کیا اور دوڑنے کی کوشش کی جب کہ پیچھے سے آنے والا نوجوان بھی تیزی سے وہاں پہنچ چکا تھا۔ توازن قائم نہ رہا اور دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گر گئے، دونوں نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ نوجوان نے اپنے سوتی کپڑے جھاڑے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُسے حجام کو آواز نہیں لگانا چاہیے تھی، اس طرح تو لڑکے کو بھاگنے کا اور بہترین موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ ان سے اور دُور نکل چکا تھا۔

حجام نے کوئی سوال، جواب کیے بغیر لڑکے کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے نوجوان سے وجہ بھی معلوم نہیں کی کہ آخر اس کے پیچھے وہ اس انداز سے دیوانہ وار کیوں بھاگ رہا ہے؟

''اور تیز دوڑیے صاحب!'' نوجوان بھی تیزی کے ساتھ اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے ان کے جوش کو مزید بڑھانے کی کوشش کی۔ دونوں اب ایک ساتھ اور تیز دوڑے۔ اب ان کے اور لڑکے کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے پکڑ لیتے کہ اندرونی سڑک سے وہ بڑی سڑک پر آ گیا۔ وہ سڑک کے کنارے پہنچے ہی تھے کہ درمیان میں ایک بڑا ٹرالر آ گیا۔ وہ سڑک پار کر چکا تھا۔ انہیں ٹرالر کے گزرنے کا انتظار کرنا پڑا اور یہی موقع اس کے لیے بہت تھا۔ جب ٹرالا گزرا تو انہیں سڑک کے دوسری جانب وہ نظر نہ آیا۔

دوسری جانب چار سڑکیں جا رہی تھیں۔ اب ان کے لیے یہ

فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اسے کس سڑک پر تلاش کریں؟ دونوں نے ایک ایک سڑک چنی اور اس میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے الگ الگ دوڑنا شروع کر دیا۔ اپنی یہ کوشش انہیں اب بے کار سی نظر آئی۔ لڑکا بے حد چالاک تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر غائب ہو چکا تھا۔ دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر اندازے لگاتے ہوئے واپس مرکزی سڑک پر پہنچے۔

''آپ کا بے حد شکریہ!'' نوجوان نے بے حد متانت سے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کل نفسانفسی کے دور میں کون کسی کے فائدے میں ساتھ دیتا ہے۔

''ارے اس میں شکریہ کیسا! اور پھر ہمیں تو یہ لڑکا جُل دینے میں کام یاب ہو گیا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' نوجوان نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''ویسے اس کے پیچھے بھاگنے کی وجہ؟'' حجام نے کافی دیر سسپنس برداشت کیا تھا اب بھلا کیسے خاموش رہتا۔

''دراصل اس کو میں نے اپنے پڑوس کے ایک بنگلے سے مشکوک حالت میں ایک بیگ لے کر جاتے دیکھا تھا۔''

''اچھا...... پھر؟'' حجام نے سادگی سے سوال کیا۔

''میں نے اس سے سوال کرنے کے لیے آواز لگائی تو یہ ایک دم دوڑ لیا۔'' نوجوان نے کہا۔

''اوہ! تو تمہیں ان پر شک ہو گیا تھا......؟''
وہ جذباتی ہو کر بولے۔

''اگر وہ بھاگتا نہیں تو صورتِ حال مختلف ہوتی!''

حجام کی سمجھ میں بات آ چکی تھی لیکن وہ لڑکا اس وقت ان کے سامنے نہیں تھا، اس لیے چوری شدہ مال کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے دوست......! یہ لڑکا اس علاقے کا تو نہیں لگتا لیکن فکر نہ کرو، اسے میں کہیں نہ کہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔''
اس نے نوجوان کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

''بڑی مہربانی!'' وہ نوجوان بولا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتایا اور رخصت لے کر روانہ ہو گئے۔

......☆......

وہ لڑکا جس کا نام تاجو تھا، پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ان دونوں سے بچتا بچاتا، شہر کے آخری حصے میں واقع کھیتوں میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے لیے یہاں پر بیٹھنے کی ایک جگہ مخصوص کی ہوئی تھی۔ وہ درختوں کی اوٹ میں اپنے حصے میں پہنچا۔ اس نے اپنے کاندھے سے بیگ اُتارا اور ایک جانب رکھ دیا۔ کچھ دیر وہ اپنے اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اس طرف نہیں ہے تو اس نے بیگ کھولا، اندر جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے اندر موجود چیزوں کو باہر نکالا، اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ خوشی کی ایک لہر تھی جو اس کے رگ و پے میں دوڑ چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت قیمتی مال وہ اپنے ہمراہ کہیں سے چرا کر لے آیا ہے۔ اس نے بیگ میں موجود چیزوں کو احتیاط سے دوبارہ واپس اندر رکھا۔ اپنے ٹھکانے پر موجود بہت سارے پتوں کو اس نے ایک طرف سمیٹا۔ بیگ پتوں کے اندر دبایا اور پھر وہاں سے اُٹھ گیا۔ اب اس کا رُخ ایک بار پھر شہر کی جانب تھا۔ شاید وہ کسی اور واردات کے موڈ میں تھا۔

اس بات کو کافی دن ہو چکے تھے۔ حجام، اس واقعہ کو بھول چکا تھا۔ ایک روز اس کی موٹر سائیکل، گھر سے دُور ایک علاقے میں پنکچر ہوئی تو اس نے گاڑی ایک پنکچر والے کی دُکان پر کھڑی کر دی۔ پہلے ہی تین گاڑیاں وہاں کھڑی تھیں، اسے اپنی باری کا انتظار کرنا تھا۔ اس کی گاڑی کا وہیل کھولنے ایک لڑکا آیا۔ حجام وہاں ایک بنچ پر بیٹھا اسے ٹائر کھولتا دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہی اس لڑکے کے حلیے اور ڈیل ڈول نے اس روز والے واقعے کا نقش ایک بار پھر اس کے ذہن پر اُبھار دیا۔ اس نے لڑکے کا چہرہ تو نہیں دیکھا تھا لیکن اُسے ایسا لگا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو کچھ دن پہلے ایک بیگ چُرا کر بھاگ رہا تھا۔ وہ ایک جوش کے ساتھ اُٹھا کہ اس لڑکے کو پکڑ کر اس کی دھنائی شروع کر دے لیکن اس خیال کو ایک لمحے کے لیے جھٹک دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بازار میں کسی کی دُکان پر بیٹھا ہے، لڑکا محنت کش ہے اور محض شک کی بنیاد پر کیسے وہ کسی دُکان دار کے آدمی پر ہاتھ ڈالتا۔ اس نے اس بارے میں کچھ سوچنا شروع کر دیا۔

اب اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ پہلے اس لڑکے کے بارے میں اس کے مالک سے بات کرے گا۔ جب گاڑیوں کے مالکان پنکچر لگوا کر رخصت ہوئے اور اس کا بھی اُٹھنے کا نمبر آیا تو وہ

رقم دے کر واپس لے رہا تھا کہ اُستاد نے اس لڑکے کو چائے لینے کے لیے ہوٹل بھیج دیا۔ یہ موقع ان کو اچھا ہاتھ آ گیا۔ اس نے لڑکے کے حوالے سے معلومات حاصل کیں۔

''ارے یہ لڑکا تو بہت ایمان دار ہے۔ کبھی ایک روپے کی بھی چوری اس نے نہیں کی۔'' مالک بہت سخت تھا لیکن اس کے منہ سے اس لڑکے کی گواہی نے حجام کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آیا وہ چور ہو بھی سکتا ہے کہ نہیں۔

''میں نے کئی بار دُکان سے غائب ہو کر دیکھا ہے، میری غیر موجودگی میں جو بھی پنکچر لگا، اس نے پورے پورے پیسے دیئے۔ کبھی ہیرا پھیری نہیں کی۔''

اب حجام نے کچھ اور ہی سوچا۔ پہلے اس نے اس کے گھر جا کر اس کے حالات جاننے کی کوشش کرنا تھی اور پھر اس لڑکے کی شام کی حرکات پر نظر رکھنے کے بعد کوئی آخری فیصلہ کرنا تھا۔ اسے علم ہوا کہ پنکچر والا اسے محض 30 روپے روزینہ دیتا ہے۔ وہ آٹھ سے دس گھنٹے محنت کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اسے اس بات پر حیرانی تھی کہ اتنی کم اجرت پر یہ لڑکا اتنا وقت یہاں گزارتا ہے تو کیوں؟ اسے اس معاملے میں بس یوں ہی دل چسپی ہو گئی تھی اور وہ اس سلسلے میں جاسوسی کی حد تک معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

جب اس نے اس کے گھر کا رُخ کیا تو علم ہوا کہ وہ ایک غریب گھرانہ ہے۔ اس کا باپ بھی مزدوری کرتا ہے لیکن آٹھ بچوں کی اکیلے کفالت نہیں کر سکتا، اس لیے اس نے اپنے تینوں چھوٹے بڑے بچوں کو کام پر لگا رکھا ہے۔ اس نے صرف اور صرف کام، کام کے اصول پر عمل کر کے گھر کے چولہے کو جلانے کو ترجیح میں رکھا تھا۔ باپ بڑا سخت تھا۔ بچے اس سے ڈرتے تھے، اس لیے ان کا اِدھر اُدھر بھٹکنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ پھر یہ لڑکا کیسے چوری کر سکتا ہے؟

حجام نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کہیں میرا اس لڑکے پر شک غلط تو نہیں؟ اس بات پر غور کرنے کے لیے اس نے دو چار بار اور پنکچر والے کی دُکان کے پاس گزر کر اس لڑکے کو چیک کیا۔ اب تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کے پیچھے وہ بھاگا تھا۔

اب اس کے ذہن میں یہ تھا کہ اس نوجوان کو ساتھ لے کر اس لڑکے کی نگرانی کی جائے اور اسے کسی واردات میں رنگے ہاتھوں پکڑوایا جائے۔ اس نے نوجوان سے مل کر اسے ساری کہانی سنائی۔ جب اس نے اس کی نگرانی کرنے کی بات کی تو نوجوان بھی خوش ہو گیا۔ وہ ٹی وی پر جاسوسی کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر اس قسم کی حرکات کے لیے ہر وقت اپنے آپ کو تیار پاتا تھا۔ اب تو اسے یہ موقع خود بخود ہاتھ آ رہا تھا۔

انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ شام سات بجے اس لڑکے کی چھٹی ہوتی ہے اور وہ اس دوران اس کی نگرانی کریں گے۔ جب اس کی چھٹی ہوئی تو وہ اس لڑکے کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر چلے۔ انہیں

اس وقت خاصی مایوسی ہوئی، جب وہ اس دُکان سے سیدھا اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ دو تین دن تک انہیں کوئی کام یابی نہیں ہوئی کیوں کہ وہ لڑکا تو اپنے معاملات میں بالکل پابند تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا ہے، اس لیے وہ کہیں اِدھر اُدھر ہوتا ہی نہیں۔

اب بھلا وہ کیا چوری کرتا ہو گا اور کیسے؟ نوجوان نے صبح سویرے اس کی نگرانی کا مشورہ دیا۔ وہ دُکان نو بجے کھولتا تھا۔ انہوں نے اس کے گھر کی نگرانی شروع کی۔ اب انہیں کام یابی کے کچھ آثار لگے۔ اس لیے کہ وہ صبح آٹھ بجے ہی گھر سے نکل گیا تھا اور اس کا رُخ دُکان کی جانب نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ابھی اس کے پاس ایک گھنٹا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا کھیتوں کی طرف پہنچ گیا ہے۔ اس نے مکمل مطمئن ہونے کے بعد اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ کافی فاصلہ رکھتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا تو وہ آہستگی سے اندر داخل ہوئے۔

اِدھر اس نے بیگ نکالا اور اندر سے سامان نکالنے لگا، ایسے میں وہ دونوں اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

''آخر ہم تمہیں پکڑنے میں کام یاب ہو گئے ہیں؟'' حجام نے چلّا کر کہا۔ وہ ایک دم چونک کر مڑا۔ اس کے سامنے وہ دونوں موجود تھے۔ اس کے ہاتھوں سے بیگ کا سامان گر پڑا۔

''تو تم چوریاں کر کے مال یہاں چھپا کر رکھتے ہو؟''

''چو...... ری...... ن...... نہیں تو!'' وہ چونک کر بولا۔

''تم دُکان پر اور گھر والوں کے آگے شریف بنے رہتے ہو اور یہاں مال جمع کرتے ہو۔'' نوجوان غصے سے چلایا۔

''لاؤ، مال ہمارے حوالے کرو۔'' حجام نے آگے بڑھ کر اس کے سامان کو چھیننے کی کوشش کی۔

''ن...... نہیں...... کوئی مال نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے اپنی قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے مال کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تھا۔ وہ ترچھا بیٹھا تھا اس لیے وہ دونوں اب تک یہ اندازہ لگانے میں ناکام تھے کہ اس کے پاس کوئی زیور ہے یا پھر نقدی۔ جب اس نے آسانی سے سامان ان کے حوالے نہیں کیا تو انہوں نے اس کے ساتھ زور آزمائی کی۔ وہ لڑکا تھا اور یہ دونوں بڑے اور حجام تو ماشاء اللہ طاقت ور تھا۔ اس کے ہاتھوں سے جب مال نکل کر گرا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ کورس کی کچھ کتابیں تھیں۔

''ہائیں یہ کیا؟!'' نوجوان چونکا۔

''چوری شدہ مال کہاں ہے؟'' حجام نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

''کوئی چوری نہیں کی میں نے!'' اس نے اب کی بار سخت لہجے میں کہا۔

حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں پتوں میں کچھ اور چیزوں کے آثار نمایاں ہیں۔ اس نے وہاں سے پتے ہٹانا شروع کیے تو ایک تختی، دوات، قلم اور کاپیاں وغیرہ ملیں۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

''تو یہ سب کچھ تمہیں یہاں رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' نوجوان نے حیرانی سے سوال کیا۔

''میرا باپ غصے کا بہت سخت ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہنا شروع کیا۔ ''مسلسل غربت اور بیماری نے اسے چڑچڑا کر کے رکھ دیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''وہ صرف پیٹ کا ایندھن بھرنے کی بات کرتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کے نام سے اسے نفرت سی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' حجام بھی غم زدہ ہو گیا۔

''مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ کتابیں بھی نہیں خرید سکتا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ بنگلے والے جب نیا کورس خریدتے ہیں تو پرانا کورس کہیں پچھواڑے میں پھنکوا دیتے ہیں۔ میں ایسی جگہوں سے کتابیں، کاپیاں لا کر یہاں جمع کرتا ہوں۔''

''اب سمجھ میں آیا۔'' نوجوان اپنے آپ سے بڑبڑایا۔ اس دن بنگلے سے اس کا نکلنا اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔

''ابا کے خوف اور مار کے ڈر سے میں روزانہ صبح سویرے یہاں آ کر کچھ دیر کتابیں پڑھتا ہوں اور لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ دیکھو! میں نے تختی پر کچھ الفاظ بھی لکھے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے معصومیت کے ساتھ تختی ان دونوں کے آگے بڑھا دی۔ چند لفظ خوب صورتی سے بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے پڑھنے کے والہانہ شوق نے حجام کو بھی نم دیدہ کر دیا۔ اس نے اسے اپنی جانب کھینچا اور جلدی سے گلے سے لگا لیا۔ اس نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ اس کے پڑھنے لکھنے کے شوق کو ضرور نتیجہ خیز بنائے گا۔ ☆☆

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں ایک بستی سدوم نامی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ کو اپنا پیغمبر اور نبی بنا کر بھیجا۔
حضرت لوطؑ کی قوم کے لوگ بڑی بے حیائی کے کام کیا کرتے تھے۔ چوری ڈاکہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔
حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو بار بار سمجھایا کہ تم اپنی بیویوں کو چھوڑ کر لونڈوں سے کیوں رغبت رکھتے ہو، یہ بہت ہی برا فعل ہے۔ اس سے باز آؤ لیکن ان پر حضرت لوطؑ کی وعظ و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ الٹے ان کے خلاف ہو گئے اور مجبور کرنے لگے کہ اگر تم ایسے ہی نیک پاک ہو تو اس بستی سے نکل جاؤ۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر خدا کا کوئی عذاب نہ آ جائے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان برے کاموں سے باز آؤ اور خدا کے نیک بندے بن جاؤ تاکہ اپنی دنیا اور عاقبت کو سنوار سکو اور یقین کرو کہ مجھے اللہ نے تمہاری طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہاری بھلائی ہی کے لیے کہتا ہوں۔ میں تم سے کوئی معاوضہ یا اجر طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر تو میرے رب کے پاس ہے لیکن ان پر حضرت لوطؑ کی وعظ و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ الٹا ان کو تنگ کرنے لگے اور کہا کہ جس عذاب سے تو روز ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے تو ایک دن اس عذاب کو ہم پر لے آ۔ آخر خدا کا غضب جوش میں آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو فنا کرنے کا پختہ تہیہ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب کے لیے اپنے فرشتے بھیجے۔ یہ فرشتے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے اور ان کو حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی خوشخبری سنائی اور جب انہوں نے بتایا ہم فرشتے ہیں اور فلاں بستی پر عذاب لانے کے لیے بھیجے گئے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ چوں کہ نیک بندے تھے اور دنیا کی بھلائی چاہتے تھے اس لیے وہ فرشتوں سے جھگڑنے لگے کہ ایسا نہ کرو۔ اس بستی میں اللہ کا نبی لوطؑ بھی رہتا ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ سوائے لوطؑ کی بیوی کے اس کے گھر والوں کو بچا لیا جائے گا اور صبح تک اس بستی کا نشان تک نہ ہوگا۔ اس کے بعد فرشتے انسانوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے مکان پر آئے۔ ان خوب صورت نوجوانوں کو دیکھ کر حضرت لوطؑ بہت پریشان اور رنجیدہ ہوئے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی نے ساری قوم کو بتا دیا کہ ہمارے گھر میں لونڈے آئے ہیں۔ اس لیے وہ سب آپ کے مکان پر جمع ہو گئے اور کہا کہ ان کو ہمارے حوالے کر دو۔ حضرت لوطؑ نے کہا دیکھو یہ میرے مہمان ہیں ان کو تنگ نہ کرو اور میری عزت کو بھی خراب نہ کرو۔ میری لڑکیاں اپنے نکاح میں لے لو جو ایک جائز فعل ہے مگر وہ نہ مانے اور ان کا اصرار بڑھتا گیا۔ فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو بتایا کہ ہم اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ صبح تک اس بستی کا دنیا کے تختے پر نام و نشان تک باقی نہ ہوگا۔ تم اپنے گھر والوں کو لے کر رات کی تاریکی میں اس بستی سے نکل جاؤ لیکن تمہاری بیوی اس عذاب سے نہیں بچ سکتی۔ چناں چہ رات کے آخری حصے میں حضرت لوطؑ اپنے گھر والوں کو لے کر اس بستی سے نکل گئے۔
اگلے دن یہ بستی کھنڈرات کا ایک ڈھیر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر پتھروں کی بارش کی اور زمین کو ان پر الٹ دیا اور اس طرح حضرت لوطؑ کی قوم خدا کے عذاب میں آ کر ہمیشہ کے لیے دنیا سے نابود ہو گئی۔

پنسل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جولائی 2016ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام:

مقام:

مکمل پتا:

موبائل نمبر:

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ نبی کریم ﷺ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا، اس کا لغوی مطلب کیا ہے؟

i۔ بڑی بستی ii۔ بڑی مچھلی iii۔ بڑا ریگستان

2۔ دھاتوں کی تخلیق کو سائنسی اصطلاح میں کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ مکینیکل انجینئرنگ ii۔ میٹالرجیکل انجینئرنگ iii۔ کیمیکل انجینئرنگ

3۔ ڈالر کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ ڈالرنگ ii۔ تھالر iii۔ ڈالرک

4۔ یہ شعر بال جبریل سے لیا گیا ہے۔ نظم کا نام بتائیے اور شعر مکمل کیجیے۔

اٹھو! میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو ....

5۔ پاکستان کی سب سے بڑی جھیل (کلری) کس قدیم شہر کے قریب واقع ہے؟

i۔ حیدر آباد ii۔ ٹھٹھہ iii۔ سکھر

6۔ جنیوا کراس کیا ہے؟

i۔ جنیوا کے چوراہے کا نام ii۔ ریڈ کراس کا پرانا نام iii۔ سیاست میں دوغلاپن

7۔ فلسطین کا قدیم نام کیا ہے؟

i۔ کنعان ii۔ یروشلم iii۔ تل ابیب

8۔ اسکاوٹ بوائے تنظیم کے بانی کا کیا نام تھا؟

i۔ بیڈن پاؤل ii۔ لارڈ اسکاوٹ iii۔ چارلس گارڈن

9۔ موٹر ریس کے دوران کس رنگ کی جھنڈی ڈرائیور کو خطرے سے آگاہ کرتی ہے؟

i۔ سرخ جھنڈی ii۔ پیلی جھنڈی iii۔ سبز جھنڈی

10۔ لبنان کے کس شہر کو ہوٹلوں کا شہر کہا جاتا ہے؟

i۔ طرابلس ii۔ بیروت iii۔ سعیدہ

جوابات علمی آزمائش جون 2016ء

1۔ لوہا 2۔ حضرت معین الدین چشتی 3۔ اپی ڈرمس 4۔ ولیم زوگجن
5۔ اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی 6۔ وارث شاہ 7۔ روانڈا
8۔ نیالا 9۔ گجرات 10۔ نیلسن مینڈیلا

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد عبداللہ ساجد، گوجرانوالہ (150 روپے کی کتب)
☆ حسیمہ چوہدری، ساہی وال (100 روپے کی کتب)
☆ محمد حسان، سرگودھا (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:
احمد عبداللہ، ملتان۔ سمیع اللہ، گوجرانوالہ۔ زہرا بتول، لاہور۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ عبدالرافع، لاہور۔ محمد اسد، کراچی۔ منال صغیر، گوجرانوالہ۔ مہک خالد شیخ، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ غلینہ اختر، کراچی۔ عائشہ شہزاد، مریم اعجاز، لاہور۔ مرزا احسن، فیصل آباد۔ ماجد علی، سبیکا آصف، لاہور۔ محمد احمد خان، بہاول پور۔ صباحت فاطمہ، اوکاڑہ۔ ہاجرہ کاشف، لاہور۔ خنساء حسینی، بشریٰ حسینی، کلورکوٹ۔ محمد یحییٰ شکیل، ملتان۔ انوشہ فاطمہ، لاہور۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ محمد مجیر، بھکر۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ مشعال آصف، لاہور۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ محمد حسن، سرگودھا۔ عائشہ اسلم، محمد حمزہ نعمان، محمد حذیفہ ادریس، فیصل آباد۔ وجیہہ بابر، جہلوال۔ نجم السحر، ملک دال۔ محمد بلال، دہاڑی۔ ناعمہ خالد، لاہور۔ محمد اسداللہ، گوجرانوالہ۔ علی طاہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اسامہ ظفر راجہ، مری۔ سلمیٰ رضا، لاہور۔ صائمہ کاردار، ملتان۔ بشریٰ ناز، ساہی وال۔ زینت عمران، گجرات۔ ظلم ہما، شیخوپورہ۔ طہٰ، اسلام آباد۔ محمد عبداللہ، سرگودھا۔ یونس امین، کراچی۔ صدیق فاروق، کوئٹہ۔ نازنین امیر، بھلوال۔ منیر احمد، گوجرانوالہ۔ تنویر حسین، لاہور۔ مریم یونس، راول پنڈی۔ طیبہ نثار، خوشاب۔ ضحویٰ رائے، کبیر۔ محمد فلال، ساہی وال۔ طوبیٰ ناز، کراچی۔ طلحہ صادق، کوئٹہ۔ یٰسین خان، پشاور۔ طاہرہ فاطمہ، گجرات۔ نصیر اکبر، چک امرا۔ صالحہ ناز، سرگودھا۔ مہ ناز، لاہور۔ فرناز، منڈی بہاؤالدین۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ محمد ارشاد، بہاول پور۔ زوہیب احمد، ملتان۔ احسن آفاق، اسلام آباد۔ آصفہ ممتاز، جھنگ۔ وقار یونس، بورے والا۔ مریم عبداللہ، پشاور۔ عبداللہ نعیم، چنیوٹ۔ نگہت سلیم، گجرات۔ اظہر عباس، پشاور۔ وقار صادق، راول پنڈی۔

میری زندگی کے مقاصد

عبدالواحد، اسد حانور پور تھل

میں پڑھ لکھ کر کسی رسالے کا ایڈیٹر بنوں گا۔

عروج فاطمہ، ٹیکسلا

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا علاج کروں گی۔

فروا جمیل، لاہور

میں بڑی ہو کر انجینئر بنوں گی اور ملک کا نام روشن کروں گی۔

محمد ارحام علی، جوہر آباد

میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔

ذکا اللہ، اسد حانور پور تھل

میں آرمی آفیسر بن کر ملک سے دہشت گردوں کا خاتمہ کروں گا۔

عالیان ارشد، لاہور

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

انصار احمد، ڈیرہ اسماعیل خان

میں اپنے والد کی طرح فوج میں جا کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

منصور احمد، اسد حانور پور تھل

میں بڑا ہو کر وکیل بنوں گا اور مظلوموں کی مدد کروں گا۔

عبدالمعید قریشی، ٹیکسلا

میں بڑا ہو کر چاند پر جاؤں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

محمد عبدالرحمٰن، سرائے عالمگیر

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔

محمد عثمان، اسد حانور پور تھل

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے گاؤں کے لوگوں کا مفت علاج کروں گا۔

زینب خان، پشاور

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

کاشف عبدالناصر، کلور کوٹ

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

عبدالمطلب، اسد حانور پور تھل

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

آمنہ وسیم، ایبٹ آباد

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور ملک کا نام پوری دنیا میں روشن کروں گی۔

محمد مدثر صدیق، کراچی

میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور اپنے ملک کی خدمت کروں گا۔

محمد زیشان، اسد حانور پور تھل

میں انجینئر بن کر ڈیم بناؤں گا اور پاکستان سے لوڈشیڈنگ کو ختم کروں گا۔

محمد عمر، فیصل آباد

میں بڑا ہو کر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کروں گا اور دعائیں لوں گا۔

سلیمان ایوب، کراچی

میں بڑا ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں۔

اللہ کی بندگی

خواجہ حسن بصریؒ نے بصرہ میں ایک غلام خریدا، وہ غلام بھی ولی اللہ اور تہجد گزار تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اس سے پوچھا۔ ''اے غلام! تیرا نام کیا ہے؟'' اس نے کہا۔ ''حضور! غلاموں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مالک جس نام سے چاہے، پکارے۔''

آپؒ نے فرمایا۔ ''اے غلام! تجھ کو کیسا لباس پسند ہے؟'' اس نے کہا۔ ''حضور! غلاموں کا کوئی پسندیدہ لباس نہیں ہوتا، جو مالک پہنا دے وہی اس کا پسندیدہ لباس ہوتا ہے۔'' پھر انہوں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیا کھانا پسند ہے؟'' غلام نے کہا۔ ''غلاموں کا کوئی پسندیدہ کھانا نہیں ہوتا جو مالک کھلا دے، وہی اس کا کھانا ہوتا ہے۔''

خواجہ حسن بصریؒ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا۔ ''اے غلام میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔'' غلام نے پوچھا۔ ''کس نعمت کے بدلے میں آپ مجھے آزاد کر رہے ہیں؟'' آپؒ نے فرمایا۔ ''تم نے ہم کو اللہ کی بندگی سکھا دی۔'' (عاتکہ رحیم، جوہر آباد)

خروشیف

روس کے سابق وزیراعظم خروشیف ایک مرتبہ بڑے جلسے میں تقریر کر رہے تھے اور موضوع تھا۔ ''اسٹالن کے مظالم'' خروشیف نے اسٹالن کے ظلم و جبر اور زیادتی کی ایسی داستانیں سنائیں کہ مجمع دم بخود سنتا رہا۔ مجمع میں کسی نے ہمت کر کے ایک چھوٹے سے کاغذ کے پرزے پر لکھا۔ ''جب یہ سارے مظالم ہو رہے تھے، اس وقت آپ کیا کر رہے تھے؟ آپ نے اس ظلم و جبر کے خلاف کیا کیا؟''

یہ پرزہ خروشیف تک پہنچ گیا۔ انہوں نے اسے پڑھا اور تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لاجواب ہو گئے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد ڈانٹ کر بولے۔ ''جن صاحب نے یہ سوال کیا ہے وہ کھڑے ہو جائیں۔'' کوئی نہ بولا، سناٹا چھا گیا۔ خروشیف نے پھر کہا۔ ''جس نے سوال کیا ہے، کھڑا ہو جائے۔'' سوال کرنے والا پھر بھی خاموش رہا۔ خروشیف نے جواب دیا۔ ''اسٹالن کے ظلم و ستم کے دور میں، میں بھی یہی کر رہا تھا۔'' (نائزہ رزاق، خانیوال)

شائستہ گفتگو

☆ شائستگی سے گفتگو کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ شائستہ گفتگو کے نرم الفاظ کسی مریض کے لیے زندگی کا پیغام بن سکتے ہیں۔
☆ اگر آپ زندگی میں کوئی مقام اور عزت حاصل کرنا چاہیں تو اخلاق کی سیڑھی سے عزت کی بلندی پر پہنچیں۔
☆ خوش اخلاقی زندگی کا حسن ہے، خوش اخلاقی کا دامن چھوڑنے سے زندگی کی خوب صورتی ختم ہو جاتی ہے۔

(محمد حارث سعید، بورے والا)

انمول موتی

☆ کسی کو حد سے زیادہ چاہو تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔
☆ جو زیادہ پوچھتا ہے وہ زیادہ سیکھتا ہے۔
☆ بے کار آنکھ وہ ہے جس میں حیا نہ ہو۔
☆ بے کار زبان وہ ہے جس میں مٹھاس نہ ہو۔
☆ بے کار انسان وہ ہے جس میں اخلاق نہ ہو۔

مسواک کے فائدے

☆ مسواک ہمارے آقا نبیؐ کی سنت ہے۔
☆ مسواک کر کے نماز پڑھنا بغیر مسواک کیے نماز سے ستر گنا افضل ہے۔
☆ مسواک منہ کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔
☆ منہ کو خوش بودار بناتی ہے۔
☆ بینائی بڑھانے کا ذریعہ ہے۔
☆ بلغم اور منہ کی کڑواہٹ دُور کرتی ہے۔
☆ دانتوں کی زردی دُور کر کے سفیدی پیدا کرتی ہے۔
☆ حفاظت کرنے والے فرشتوں کی محبت کا ذریعہ ہے۔
☆ نیکیوں کو ستر گنا بڑھاتی ہے۔
☆ مرتے وقت کلمہ نصیب ہوتا ہے۔

(فاطمہ انور، کہوٹہ)

کچھ اچھی باتیں

خاموشی: ایسا پھل ہے جس پر کبھی کڑوا پھل نہیں لگتا۔
حسد: ایسی دیمک ہے جو انسان کو اندر اور باہر سے ختم کرتی ہے۔
ذہانت: ایسا پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔
ضمیر: ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ حق کی راہ دکھاتا ہے۔
خوش اخلاقی: ایسی خوش بو ہے جو میلوں دور سے محسوس ہوتی ہے۔
دعا: ایسا عمل ہے جو تقدیر کو تقدیر پر مات دے سکتا ہے۔
گناہ: ایسی لعنت ہے جو قلب کو کالا کر دیتی ہے۔
توبہ: ایسا دروازہ ہے جو موت کی ہچکی تک کھلا رہتا ہے۔

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

کام کی باتیں

☆ دل چسپی کو طلب مت بننے دو کیوں کہ طلب بڑھ کر ضرورت اور ضرورت بڑھ کر کمزوری بن جاتی ہے۔
☆ زندگی کے حقائق سے سنجیدہ یا رنجیدہ نہ ہوں۔ ایک بات طے ہے کہ آپ زندگی سے زندہ بچ کر نہیں بھاگ سکتے۔
☆ حرام مال اکٹھا کرنے والا اگر بخیل بھی ہے تو اس پر دوہرا عذاب ہے۔
☆ زیادہ باتونی شخص پڑھنے کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔
☆ بُرائی اور بُرے اعمال دیمک کی طرح ہوتے ہیں۔ باہر سے کچھ نہیں بدلتا، اندر سے سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے۔
☆ جب انسان کو تجربے کی کنگھی حاصل ہوتی ہے تو اس کے بال ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔

(رخام اعظم، لاہور)

حکمت کی باتیں

☆ دوست کو عزت دو، محبت دو، احترام دو لیکن راز نہ دو۔
☆ عقل مند اپنے دوستوں میں خوبی تلاش کرتا ہے۔
☆ ہمیں خود کو درخت کے پتوں کی طرح سمجھنا چاہیے، یہ درخت نوع انسانی ہیں، ہم دوسرے انسانوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔
☆ مصائب سے مت گھبراؤ کیوں کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔
☆ معافی اچھا انتقام ہے۔
☆ عمدہ طریقے سے پوچھنا بھی نصف علم ہے۔

☆ عقل جیسی دولت کوئی نہیں اور جہالت جیسی کوئی غربت نہیں۔
☆ خاموش آدمی پہاڑوں کی طرح بارعب ہوتا ہے۔
☆ جس گناہ سے نعمتوں کو زوال آتا ہے وہ غرور ہے۔
☆ جو اللہ کے کاموں میں لگ جاتا ہے اللہ اس کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

(خنسا، حسینی، کلورکوٹ)

انصاف

حضرت عمر فاروقؓ کے بڑے صاحب زادے عبداللہؓ نے ایک اونٹ خریدا اور اسے سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ جب وہ موٹا تازہ ہو گیا تو اسے بیچنے بازار گئے۔ ادھر عمر فاروقؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ فوراً بازار پہنچے اور فرمانے لگے: ”افسوس عبداللہ! افسوس! امیر المومنین کے بیٹے! تو نے انتہا کر دی افسوس۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”ابا جان بات کیا ہے؟“ آپؓ نے فرمایا۔ ”یہ اونٹ کیسا ہے؟“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ اونٹ میرا ہے۔ میں نے اسے خریدا اور پھر سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ اب یہ موٹا تازہ ہو گیا ہے تو اسے بیچنا چاہتا ہوں جیسا کہ عام مسلمان کرتے ہیں۔“ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ”ہرگز نہیں۔ امیرالمومنین کے بیٹے کے لیے بھی کسی قسم کی رعایت ہرگز نہیں۔ عبداللہ! اپنے اونٹ کی اصل قیمت لو اور منافع بیت المال میں جمع کرا دو۔“ حضرت عبداللہؓ نے حکم کی تعمیل کی۔

محنت کرو اور روزی کماؤ

کسی عقل مند آدمی کے پاس ایک غریب آدمی آیا۔ اس نے عقل مند آدمی سے کہا میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے، آپ میری مدد کریں۔ عقل مند نے اس غریب آدمی کو گہری نظر سے دیکھا اور پھر کہا، میرا ایک دوست ہے وہ انسانی اعضاء خریدتا ہے تو تمہارے پاؤں بیس ہزار کے خریدے گا۔ غریب آدمی نے کہا، نہیں! عقل مند نے کہا، وہ ہاتھ اور آنکھیں بھی خریدتا ہے۔ غریب آدمی گھبرا گیا۔ عقل مند نے کہا، تم اپنا سارا جسم بیچ دو، وہ تمہیں اس کے ایک لاکھ روپے خوشی سے دے گا۔ غریب آدمی غصے سے بولا، میں ایک لاکھ تو کیا ایک کروڑ میں بھی اپنا جسم نہیں دوں گا۔ عقل مند آدمی نے کہا۔ ہاتھ، آنکھیں، پاؤں زندگی کے انمول تحفے ہیں ان سے کام لو۔

(عبدالقیت عزیز، لاہور)

☆☆☆

ہمسائی جب بھی دیوار پر سے جھانکتی، زینت اپنے صحن میں پڑی اونگھ رہی ہوتی۔ ہمسائی دل ہی دل میں خوب تلملاتی کہ "دیکھو! ایک میں ہوں کہ سارا دن سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ ایک یہ زینت ہے کہ دن بھر آرام سے پڑی سویا کرتی ہے۔ کیا اسے گھر میں کرنے کو کچھ نہیں ہوتا......؟" ایک دن ہمسائی کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلانے کے لیے چھت پر گئی اور اپنی عادت کے مطابق ساتھ کے گھر میں جھانک کر دیکھا۔ زینت دھوپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ ہمسائی جل کر بولی:

"اے بہن جیناں! ایک بات تو بتا۔ تو سارا وقت کھٹولی پر پڑی اینڈتی رہتی ہے، تیرے گھر کا کام کون کرتا ہے؟"

ہمسائی کی آواز سن کر زینت اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہنس کر بولی:

"اے بہن! میرے گھر کا کام ہی کتنا ہوتا ہے؟ ہم ماں بیٹا دو ہی تو گھر کے فرد ہیں۔ بیٹا صبح ہی صبح کام پر چلا جاتا ہے۔ میں برتن دھو کر جھاڑو بہارو کر لیتی ہوں۔ میرے گھر میں کون سے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو کوڑا کرکٹ پھیلائیں۔ بیٹا شام کو آتا ہے تو پکانے کو کچھ لے آتا ہے۔ ہانڈی میں رات ہی کو پکا لیتی ہوں۔ دن بھر کچھ کرنے کو ہوتا ہی نہیں تو کیا کروں؟ بعض وقت میں خود تنگ پڑ جاتی ہوں۔" زینت نے ہنس کر کہا۔ ہمسائی بولی: "تو ایسے کر ایک بکری کا بچہ پال لے، تیرا دل بہلا رہے گا۔" زینت کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے اگلے ہی دن ایک ننھا منا سا میمنا خرید لیا۔ برف جیسے گول مٹول میمنے سے زینت بہت پیار کرنے لگی۔ کبھی محلے کی دکان سے اس کے لیے دودھ لینے جاتی، کبھی کھرپا ہاتھ میں لیے میمنے کے لیے ہری گھاس کھود کر لاتی، کبھی اسے نہلاتی۔ وہ بار بار مینگنیاں صحن میں بکھیرتا اور زینت کو دن میں کئی بار جھاڑو لگانا پڑتا۔ میمنا صحن میں لگائی ہوئی کیاریاں اور پھول بوٹے چر جاتا تو عورتیں زینت سے لڑنے آ جاتیں، اس پر زینت بے چاری پریشان ہوتی اور کہتی: "میں نے تو اپنی اچھی بھلی بے فکری کی زندگی کو روگ لگا لیا اور ہمسائی کے کہنے پر بکری کا بچہ پال لیا۔ میں تو اب ہر ایک سے یہی کہوں گی کہ جسے کوئی غم نہ ہو، وہ بکری کا بچہ پال لے۔"

گلاب جامن

عیدالفطر یا میٹھی عید کے موقع پر مٹھائی خاص کر گلاب جامن بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ دودھ کو اچھی طرح اُبال کر پانی کو

خشک کر کے کھویا (Khoya) تیار کر لیا جاتا ہے جسے پیڑے (Dough) کی شکل دے کر میدے کے ساتھ بھونا (Fried) جاتا ہے۔ بعدازاں ان گیند نما پیڑوں کو شیرے (Sugary Syrup) میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ ذائقے میں اضافے کے لیے سونف، عرق گلاب، زعفران یا کیوڑہ (Kewra) شامل کر دیا جاتا ہے۔ گلاب جامن کو خوب صورت اور ذائقے دار بنانے کے لیے ان پر پستہ، بادام، چاندی کے اوراق یا کریم بھی لگا دی جاتی ہے۔ خیال ہے کہ ایرانی مٹھائی (Fritter) سے گلاب جامن بنانے کا خیال 800 سال قبل قدیم انڈین کو آیا جسے موجودہ شکل میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے ایک باورچی نے متعارف کروایا۔ برصغیر پاک و ہند، ایران، افغانستان، نیپال، عرب ممالک میں یہ مٹھائی عام ریستوران اور مٹھائی کی دکانوں سے مل جاتی ہے۔ شوگر، دل کے مریض اور کولیسٹرول والے افراد کو گلاب جامن نقصان دیتے ہیں۔ ایک پنگ پانگ گیند کے سائز کا گلاب جامن 150 کلوریز انرجی رکھتا ہے جب کہ گلاب جامن میں 8 گرام چکنائی، 10 ملی گرام کولیسٹرول، 40 ملی گرام سوڈیم، 16.5 گرام نشاستہ اور 2 گرام پروٹین شامل ہوتی ہے۔ دودھ کی وجہ سے گلاب جامن میں کیلشیم بھی پایا جاتا ہے۔

بھارتی پرچم

بھارتی پرچم (Indian Flag) ایک مستطیل شکل کا ترنگا ہے جس میں زعفرانی، سفید اور سبز رنگ شامل ہیں۔ درمیان میں نیوی بلیو

رنگ کا چکر ہے جہاں سے 24 دھاریاں نکلتی ہیں۔ موجودہ پرچم کی منظوری اسمبلی نے 22 جولائی 1947ء کو دی۔ اس چکر کو "اشوکا چکر" بھی کہا جاتا ہے۔ موجودہ پرچم کی منظوری کے لیے راجندرو پرساد، مولانا عبدالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، راجہ گوپال اچاری، کے ایم منشی اور بی آر امبیڈکر پر مشتمل کمیٹی نے انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے

میں ردوبدل کی منظوری کے بعد اس پرچم کی تجویز دی، جسے وزیراعظم نہرو نے اسمبلی میں پیش کیا اور منظوری لی۔ زعفرانی رنگ مادہ پرستی سے نفرت، سفید رنگ سچائی کے راستے اور سبز رنگ اپنی مٹی سے وابستگی کا ترجمان ہے۔ بھارتی پرچم کی لمبائی چوڑائی سے 1.5 گنا زیادہ ہے۔ بھارت آبادی کے لحاظ سے دُنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔

الخوارزمی

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی ایک عظیم مسلمان سائنس دان کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ ایرانی شہر خوارزم میں 780ء کو پیدا ہوئے۔ یہ المامون کا عہد تھا۔ بغداد میں رہ کر ریاضی، فلکیات و جغرافیہ کے علوم پر دسترس حاصل کی۔ آپ نے الجبرا اور ریاضی کے اصول و قواعد متعارف کروائے جن میں وراثت، وصیت، تقسیم، خرید و فروخت، کرنسی

کا تبادلہ، اصول کرایہ داری، دائرے کا تصور، مثلث، مخروط، رباعی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپ نے متعدد کتب بھی لکھیں جن میں "الجبر و المقابلہ" خاصی مقبول ہے اور یورپ کے افراد بھی اس کا ترجمہ کروا کے یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ریاضی اور الجبرا میں فرق واضح کرنا اور اس کے اصولوں کو متعین کرنا ہے۔ دُنیا بھر میں ریاضی کا موجودہ علم الخوارزمی کے کارناموں سے جڑا ہے۔ اہلِ یورپ آپ کو "Algortmi" پکارتے ہیں۔ ٹرگنومیٹری اور آسٹرونومی کے علوم میں بھی الخوارزمی کے وضع کردہ اصول آج بھی دُنیا بھر کے سائنس دان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ نے جغرافیہ کی کتاب "صورۃ الارض" میں زمین کے حوالے سے ہوشربا انکشافات کیے۔ سائنس کی دُنیا کا یہ عظیم ستارہ 850ء کو دُنیا سے رخصت ہوا۔ 6 ستمبر 1983ء روس نے الخوارزمی کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کی۔

بابل کے معلق باغات

بابل کے معلق باغات (Hanging Gardens of Babylon) کا شمار دُنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقام تلاش کرنا باقی ہے۔ انہیں ملکہ شاہ بانو کے لیے بخت نصر (Nebuch Adnezzar) نے عہدِ بابل عراق میں بنوائے۔

ان کی حیثیت شاہی باغات کی تھی۔ یہ باغات معلق نہیں تھے بلکہ دیکھنے میں اس طرح بنوائے گئے تھے کہ درجہ بدرجہ اوپر کی طرف تعمیر کیے گئے تھے۔ اس طرح 80 فٹ اونچائی کے باعث یہ معلق نظر آتے تھے۔ پہلی صدی کے بعد یہ عظیم الشان باغات تباہ ہو گئے۔ آج یہ باغات محض خیالی تصاویر میں موجود ہیں۔ 600 قبل مسیح تعمیر ہونے والے ان باغات کو کچھ لوگ افسانوی سمجھتے ہیں، تاہم پرانی تحاریر سے پتا چلتا ہے کہ ان باغات کو پانی دینے کے لیے ایک نہر موجود تھی جہاں سے پانی اس طرح مہیا کیا جاتا تھا کہ نیچے والا باغات خراب یا فالتو گیلے نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے 20 لاکھ پتھروں کو خاص ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ انہی باتوں نے ان باغات کو "Wonder for all People" بنا دیا ہے۔

☆☆☆

1- نہ مٹی ہے نہ ریت
ایسا ہے اِک کھیت

2- چھوٹی سی اِک قطار
ڈبکی مارے جائے پار

3- پانی کا مٹکا پیڑ پہ ہے لٹکا
ہوا کا جھونکا اس کو نہیں کھٹکا

4- جناب عالی، سر پہ جالی
انتڑیاں بہت پیٹ ہے خالی
(احمد کامران، لاہور)

5- بکھرے بال کمر میں پٹی
ہو گی کسی کونے میں لیٹی

6- دن کو سوئے رات کو روئے
جتنا روئے اتنا سوکھے

7- ایک پودے پہ کھلنے والا
ایک درخت پہ ملنے والا
دو ناموں کی ایک مٹھائی
سب نے دیکھی سب نے کھائی
(مومنہ عامر حجازی، لاہور)

8- ایک بڈھے کے سر پہ آگ
گاتا ہے وہ ایسا راگ
اس کے منہ سے نکلے ناگ
جو تیزی سے جائے بھاگ
(عدن سجاد، جھنگ صدر)

9- کالا جنگل کھلا میدان
سیدھی سڑک دو مکان
(حسن رؤف، لاہور)

جوابات: 1- بال 2- سوئی 3- ناریل 4- چارپائی 5- جھاڑو 6- موم بتی 7- گلاب جامن 8- حقہ 9- بال، ماتھا، ناک

ننھی مصورہ کی مدد کریں

ننھے مصور، بچی کی تصویر تو بنا چکے ہیں۔
اب وہ چاہ رہے ہیں کہ گڑیا کے بال
مزید بہتر بنا دیے جائیں، مگر انہیں کچھ سجھائی
نہیں دے رہا کہ کون سا رستہ اختیار کریں!
آپ کی مدد سے یقیناً وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو سکتے ہیں۔
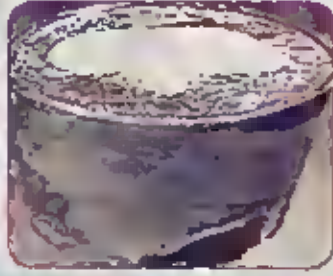
چاکلیٹ سوئرلز

اجزاء:

انڈے:	3 عدد	کوکو پاؤڈر:	1 کھانے کا چمچ
دودھ:	1/2 کپ	جیلیٹین پاؤڈر:	2 کھانے کے چمچ
پانی:	1/4 کپ	چاکلیٹ ایسنس:	1/2 چائے کا چمچ
پگھلی ہوئی چاکلیٹ:	1/2 کپ	چینی:	5 اونس
پھینٹی ہوئی فریش کریم:	1 کپ	چاکلیٹ [illegible]:	گارنش کے لیے

ترکیب: 3 عدد انڈوں کی زردی اور سفیدی کو الگ الگ کرلیں۔ 2 کھانے کے چمچ [illegible] پاؤڈر کو 1/4 کپ پانی میں حل کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ اب انڈوں کی سفیدی کو 2 اونس پسی چینی کے ساتھ پھینٹ کر فلفی کریں۔ پھر انڈے کی زردی کو 2 اونس پسی چینی، 1 کھانے کا چمچ کوکو پاؤڈر اور 1/2 کپ دودھ کے ساتھ پکائیں۔ جب وہ گاڑھا ہو جائے تو اسے نکال لیں۔ اب اس میں حل کیا ہوا جیلیٹین اور 1/2 چائے کا چمچ چاکلیٹ ایسنس شامل کریں۔ پھر اس میں 1 کپ پھینٹی ہوئی فریش کریم اور پھینٹے ہوئے انڈے کی سفیدی ملا لیں۔ اب 1/2 کپ پگھلی ہوئی چاکلیٹ کو [illegible] کرلیں، پھر اسے کریم اور کدوکش چاکلیٹ سے گارنش کر کے ٹھنڈا سرو کریں۔

فلفی ہاٹ چاکلیٹ کافی

اجزاء:

کافی: 4 کھانے کے چمچ — دودھ: 1 کپ — کریم: 1/2 کپ — چینی: 3-4 کھانے کے چمچ — چاکلیٹ بار: حسب ضرورت

ترکیب: ایک پین میں پانی اور 3-4 کھانے کے چمچ چینی شامل کر کے اتنا پکائیں کہ چینی حل ہو جائے۔ اب اس میں 4 کھانے کے چمچ کافی شامل کر کے مکس کریں اور اُتار لیں۔ پھر پین میں 1 کپ دودھ اور حسب ضرورت چاکلیٹ کو مکس کر کے پگھلا لیں۔ آخر میں اسے کافی کپ میں ڈال کر مکس کرلیں اور کریم سے گارنش کر کے سرو کریں۔

مینگو بسکوموز

اجزاء:

آم پیوری:	200 گرام	تازہ کریم:	250 گرام	چیز:	100 گرام
جیلیٹن:	20 گرام	چاکلیٹ بسکٹ:	150 گرام	آم کا جوس:	حسب ضرورت

گارنش کے لیے: آم کے سلائس — پودینہ کے پتے

ترکیب: ایک پیالے میں آم کی پیوری، تازہ کریم اور چیز کو مکس کریں۔ پھر جیلیٹن پانی میں گھول کر رکھ دیں۔ اب گلاس میں بسکٹ کا چورا ڈال کر آم کا بنایا ہوا مکسچر ڈال دیں۔ پھر آم کے جوس میں جیلیٹن پکا کر آم کے مکسچر میں ڈال کر دس منٹ کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ آخر میں آم کے سلائس اور پودینہ کے پتوں سے گارنش کریں۔

کونج

کونج موسم بہار اور موسم گرما میں شمالی یورپ اور شمالی ایشیاء میں نسل کشی کرتی ہے اور موسم سرما میں جنوبی یورپ، مشرق وسطیٰ، پاکستان، بھارت اور جنوب مشرق ایشیاء میں آتی ہے۔ اس کی ڈار میں 100 تک پرندے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی کونج بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے جو اس کی طرح شمالی علاقوں سے آتی ہے۔ پرواز کے دوران اکثر آٹھ (٨) کے ہندسے کی طرح قطار میں اڑتی ہے۔ خوراک حاصل کرنے کے لیے زمین پر اُترنے سے پہلے آسمان پر کئی چکر لگاتی ہے۔ عام طور پر سبزہ، جڑیں اور اناج کھاتی ہے۔ اس کے علاوہ کیڑے مکوڑے اور چھپکلیاں وغیرہ بھی کھا جاتی ہے۔ مئی اور جون میں نسل کشی کرتی ہے۔ کسی جھیل یا آبی علاقے میں زمین پر ٹہنیوں وغیرہ کا گھونسلا بناتی ہے جس میں دو سبزی مائل انڈے دیتی ہے۔ نر اور مادہ انڈے سیتے ہیں۔ 29 دن میں بچے نکل آتے ہیں جو ڈھائی ماہ میں بڑے ہو جاتے ہیں۔

دانہ گیر

نر کا سر اور چوٹی سیاہ، چہرے کی کھال سرخ، حلق جامنی نیلا، گردن سرخ، سینہ شوخ نارنجی، اوپر کا حصہ سلیٹی اور سیاہ اور دُم کا سرا سیاہ ہوتا ہے۔

عمودی چٹانوں پر جھاڑیوں اور کھلے جنگلات، ڈھلانوں پر اُگے جنگلات اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر 300 میٹر سے 400 میٹر کی بلندی تک ہزارہ، کوہستان، وادیٔ کاغان اور آزاد کشمیر میں پایا جاتا ہے۔

عام طور پر جوڑا جوڑا یا چھوٹی ٹولیوں میں ملتا ہے۔ صبح کے وقت اور شام ڈھلے کھلی جگہوں اور جھاڑیوں کے درمیان راستوں میں نظر آ جاتا ہے۔ باقی تمام وقت جھاڑیوں میں چھپا رہتا ہے۔ رات کو درخت پر بسیرا کرتا ہے۔ اس کی آواز ہلکی سے شروع ہو کر بلند ہوتی جاتی ہے اور کوا کوا، کا ہوا، گلواہ، کواہ جیسی ہوتی ہے۔ بیج، جڑیں، نرم پتے اور پھل اور کیڑے مکوڑے کھاتا ہے۔

یہ پرندے مئی اور جون میں نسل کشی کرتے ہیں۔ گھونسلے زمین پر جھاڑی تلے یا کسی چھوٹے درخت میں بناتے ہیں۔ مادہ تین سے چھ انڈے دیتی ہے۔ انڈوں کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے اور ان پر گہرے بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی لکیریں ہوتی ہیں۔ 28 دن میں انڈوں میں سے بچے نکل آتے ہیں۔ ☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

محترمہ فاطمہ جناح کا بچپن

رانا محمد شاہد

"میں جب گھر آتا تو بہن میرے لیے اُمید کی کرن اور مستقبل کی روشنی بن جاتی۔ میں پریشانیوں میں گھرا ہوتا اور میری صحت خراب ہوتی مگر فاطمہ کے حسن تدبر سے میری پریشانیاں دُور ہو جاتیں۔" یہ خیالات تھے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے اپنی بہن فاطمہ جناح کے لیے۔

محترمہ فاطمہ جناح 31 جولائی 1831ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ابھی صرف دو برس کی تھیں کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت محمد علی جناح اپنی تعلیم کے سلسلے میں انگلستان میں مقیم تھے۔ کمسنی میں ہی والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ جانا بہت بڑی محرومی تھی۔ آغا حسین ہمدانی اپنی تحقیقی کتاب "فاطمہ جناح، حیات اور خدمات" میں محترمہ فاطمہ جناح کے بچپن کے متعلق لکھتے ہیں۔

"فاطمہ کی عمر اس وقت دو سال تھی، جب والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ شفقت مادری سے محرومی کے بعد فاطمہ کی پرورش بڑی بہن مریم نے کی۔ جب فاطمہ باتیں کرنے اور سمجھنے لگیں تو پھر اپنے بڑے بھائی کی دل چسپ باتیں بڑے شوق سے گھر والوں کی زبانی سنا کرتی تھیں جو بسلسلہ سمندر پار تعلیم کے حصول کے لیے گیا تھا۔ بچوں کی طرح فاطمہ پوچھتی کہ میرا بھائی کیسا ہے تو مریم بتاتی کہ نہایت خوب صورت، چاند کا ٹکڑا، سرو کا بوٹا۔ فاطمہ بھائی کی تصویر دل میں اُتارنے کی کوشش کرتی مگر جب مشکل بنتی تو پھر پوچھتی کہ اچھا تو بھائی کی باتیں کیسی ہوتی تھیں۔ جواب ملتا، بہت دل چسپ۔ وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ وقت گزارتے مگر جب باتیں کرتے تو اتنی پیاری اور میٹھی کہ نیند آ جاتی۔"

یوں فاطمہ نے بچپن میں ہی اپنے بھائی کی باتیں کر کر کے اور اسے یاد کر کے تین سال گزار دیے۔ پھر ایک روز ننھی فاطمہ کو پتا چلا کہ آج اس کا وہی بھائی اپنی تعلیم مکمل کر کے انگلستان سے واپس آ رہا ہے جن کے بارے میں وہ باتیں سنتی رہی ہے۔ محمد علی کے آنے کی سب سے زیادہ خوشی فاطمہ کو تھی۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ اس کی عمر چھوٹی تھی اور چھوٹی عمر کا بچہ اپنے دل میں ایک بڑی دُنیا بناتا ہے اور پھر وہ اس کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ بھائی سامنے آیا تو اس نے فاطمہ کو گود میں اُٹھا لیا اور پھر اس ننھی منی پری کی باتیں سننے لگے۔ اس وقت فاطمہ کی عمر چار برس تھی۔

محمد علی نے بہتر مستقبل کے لیے کراچی کی بجائے بمبئی کا رُخ کیا۔ محنت اور کام سے لگن کی وجہ سے بہت جلد اپنا مقام بنا لیا۔ اس دوران عارضی طور پر پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز

ہوئے مگر جلد ہی اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس دوران انہوں نے اپنے والد کو خط اور تار بھیجے کہ وہ خاندان سمیت ان کے پاس بمبئی آ جائیں۔ یہاں حالات موافق ہیں۔ چناں چہ اس صورت حال کے بارے میں محترمہ فاطمہ جناح اپنی کتاب ''میرا بھائی'' میں لکھتی ہیں۔

''جناح بھائی کی رفیقہ حیات ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں اور وہ ناامید ہو چکے تھے کہ ان کا کاروبار ان کے بیٹوں کے حصے میں آئے گا۔ لہٰذا تلخ یادوں کے سوا کراچی میں ان کے لیے اور کچھ نہ تھا تو والد نے سوچا کہ بمبئی جانا ہی بہتر ہے اور یہ سوچ کر والد اپنے خاندان سمیت بمبئی آ گئے۔''

یہ 1900ء کا زمانہ تھا۔ والد نے گھر پر ہی فاطمہ کی ابتدائی تعلیم کا مناسب بندوبست کر لیا تھا۔ 1902ء میں والد کے انتقال کے بعد فاطمہ کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری محمد علی جناح پر آن پڑی۔ چناں چہ انہوں نے پرورش اور تربیت سب کچھ اپنے ذمہ لے لیا۔ انہوں نے بڑی محبت سے ان کی تربیت کی اور بہترین تعلیم دلوائی۔

اس زمانے میں انگریزی تعلیم کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ لوگ زیادہ تر اپنے بچوں کو انگلش اسکولوں میں پڑھا رہے تھے۔ محمد علی جناح اسلامی نظریے پر کاربند تھے اور کچھ حالات ایسے تھے جس کی وجہ سے وہ فاطمہ کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے پریشان تھے۔ چناں چہ ان پریشان کن حالات کے بارے میں آغا حسین ہمدانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تعلیم ان کے بھائی کے لیے پیچیدہ مسئلہ بن گئی تھی۔ جیسے ہی محمد علی نے فاطمہ کو ایک اسکول میں داخلہ کرانا چاہا، جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی، تمام خاندان والوں نے مخالفت شروع کر دی اور کسی نے اس سے اتفاق نہیں کیا کہ لڑکی کو انگریزی پڑھائی جائے۔ محمد علی جناح جنہیں خدا نے پیدا ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنے خاندان کی، اپنی قوم کی اور اپنی ملت کی آبرو کو سنواریں، اس مخالفت کو اہمیت نہ دی۔ خاندانی بزرگوں نے فاطمہ کو قائل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ بددل ہو کر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دے مگر محمد علی برابر حوصلہ افزائی کرتے رہے اور فاطمہ سے کہا جو فیصلہ کر لیا جائے، اس پر قائم رہنا چاہیے۔ فاطمہ کی عملی زندگی کا یہ پہلا سبق تھا جو انہوں نے اپنے عظیم بھائی سے حاصل کیا۔ محمد علی نے جبراً فاطمہ کو اسکول نہیں بھیجا تھا۔ فاطمہ کو بھی ابتداء میں اسکول جانے کے نام سے خوف آتا تھا، مگر جس طریقے سے محمد علی نے بہن کے دل سے یہ خوف دُور کیا، وہ قابلِ ذکر ہے۔''

محمد علی اپنی چھوٹی بہن کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواہاں تھے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے انہوں نے آہستہ آہستہ بہن کو تعلیم کی اہمیت اور افادیت بتائی اور اس حوالے سے ان کا خوف و خدشات دُور کیے۔ ایک روز وہ فاطمہ کو بگھی میں بٹھا کر باندرا کے اسکول لے گئے۔ بگھی جس جگہ رُکی، وہاں بہت سی بچیاں خوب صورت کپڑے پہنے لکھائی پڑھائی اور کھیل کود میں مصروف تھیں۔ محمد علی نے بہن سے کچھ کہنے کی بجائے، خاموشی سے انہیں اسکول کے مختلف حصے دکھائے۔ ایسا انہوں نے کئی بار کیا۔ یوں فاطمہ کو اسکول کے ماحول اور در و دیوار سے انسیت ہو گئی اور ان کا دل بھی یہاں پڑھنے کے لیے مچلنے لگا اور ایک دن انہوں نے اس کا اظہار اپنے بھائی سے کر دیا۔ پھر محمد علی نے نہ صرف فاطمہ کو اسکول میں داخل کروا دیا بلکہ رہائش کا انتظام بھی کر دیا۔ چوں کہ اسکول محمد علی کی رہائش گاہ سے دور تھا۔ اس لیے وہ ہر اتوار کو بہن سے ملنے اسکول آ جاتے۔ فاطمہ بڑی ذہین اور محنتی طالبہ تھیں، اس کا اعتراف ان کی اساتذہ کرتی رہتی تھیں۔ روز کا کام روز کرنے سے وہ اپنی اساتذہ کے دل میں گھر کر گئیں۔ اچھے کردار و اچھے اخلاق کی وجہ سے فاطمہ کی سہیلیاں اسے بہت پسند کرتی تھیں۔ 1906ء میں وہ سینٹ پیٹرک اسکول میں داخل ہوئیں، جہاں سے 1910ء میں انہوں نے میٹرک کیا اور پھر بھائی کے پاس آ گئیں۔ بہن بھائی میں اکثر باتوں پر نوک جھونک ہوتی رہتی۔ کبھی ناراض ہوتے تو ایک دوسرے سے بات چیت بند ہو جاتی مگر کھانے کی میز پر آتے ہی باتیں شروع ہو جاتیں۔ بعض اوقات فاطمہ جب ناراض ہوتیں تو گھنٹوں کمرے سے باہر نہ آتیں تو محمد علی انہیں مناتے اور ان لیے انہیں ''فطی'' کہہ کر بلاتے اور اتنا کہتے ہی بہن کی ناراضگی ختم ہو جاتی۔ محمد علی جناح نے فاطمہ جناح کی پرورش ایک شفیق باپ کی طرح کی۔ ان کی ہر خواہش کا احترام کیا۔ فاطمہ جناح جس قسم کا لباس یا زیور پسند کرتیں، محمد علی جناح انہیں مہیا کرتے۔ جہاں تک انہوں نے تعلیم حاصل کرنا چاہی، بھائی نے ہر ممکن سہولت مہیا کی۔

☆☆☆

پیارے بچو! متین کی دادی اماں باقاعدگی سے پانچوں وقت نماز پڑھتی تھیں۔ فجر کی نماز کے بعد وہ گھر کے لان میں چہل قدمی بھی کرتیں۔ وہ اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو بھی صبح سویرے جاگنے کی تلقین کرتی تھیں۔ جب بھی صبح کے وقت انہیں موقع ملتا وہ تمام بچوں کو اپنے قریب بٹھا لیتی تھیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ایک تخت پوش پر بیٹھا کرتی تھیں۔ دادی اماں سب بچوں سے قرآنِ پاک کی چھوٹی چھوٹی دعائیں سنتی تھیں۔ آج بھی فجر کے بعد وہ چہل قدمی سے فارغ ہوئیں تو سارے بچے ان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ دادی اماں کے ہاتھ میں تسبیح بھی تھی۔ وہ بچوں سے باتیں بھی کرتیں اور تسبیح بھی پڑھتی جاتیں۔ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں بچوں کو مخاطب کیا۔

"پیارے بچو! اگر تم میرے سوال کا درست جواب دو گے تو اس عید پر میں تمہیں بہت ساری عیدی انعام میں دوں گی۔ سب بچے بول پڑے: "دادی اماں، جلدی سے پوچھیے!" دادی اماں بولیں:

ایک باپ کے سو ہیں بیٹے ۔ گول مول سب ایک ہی جیسے
چلیں پھریں سب ایک ہی ساتھ ۔ سب کے پیٹ میں ایک ہی آنت

پیارے بچو! دادی اماں کے سوال کا درست جواب دے کر اپنے آپ کو کھوج لگائیے کے انعامی مقابلے میں شامل کریں۔
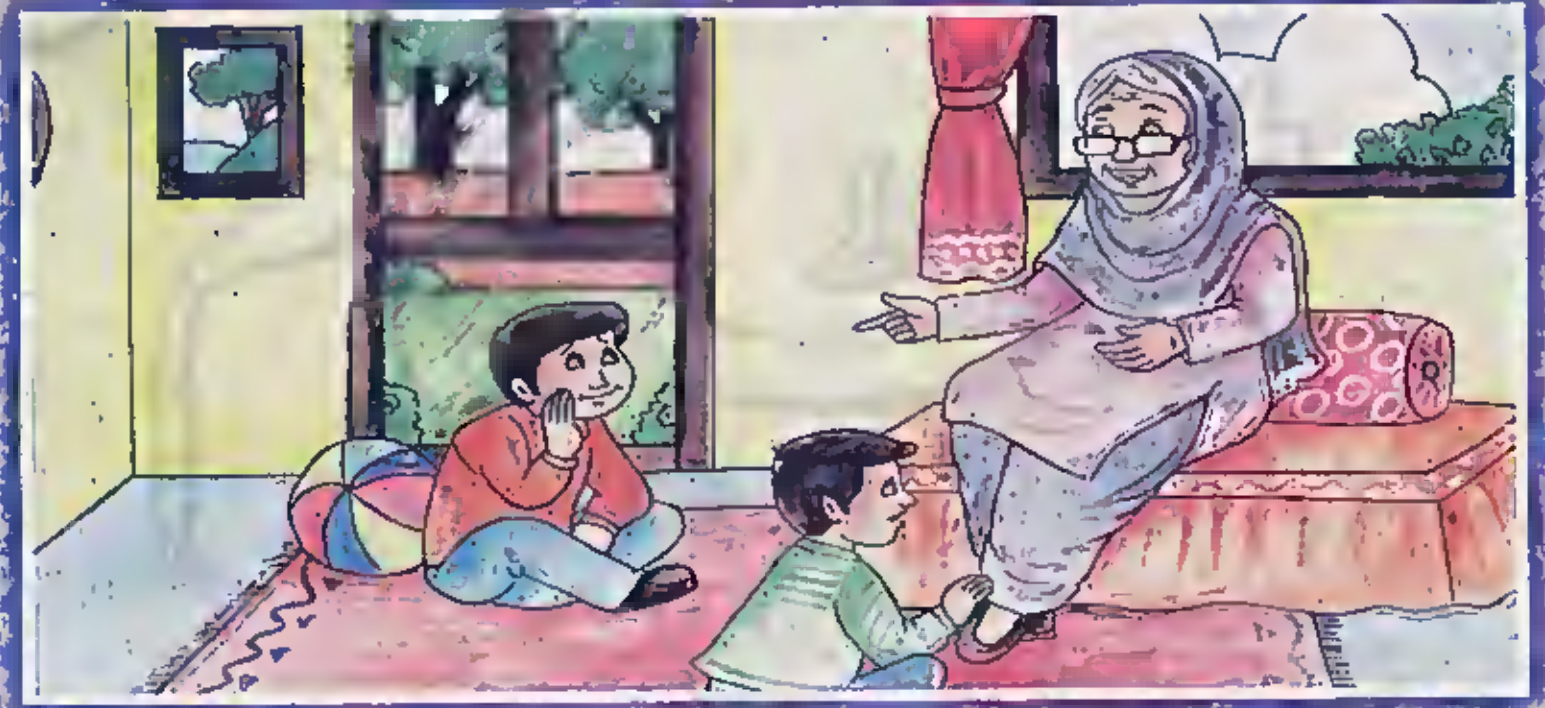
پیارے بچو! جون 2016ء کے کھوج لگائیے کا جواب یہ ہے:

چپڑاسی نے ذیشان کا پن چرایا تھا۔ پن لیک کر رہا تھا جس کی سیاہی کا نشان اس کی جیب پر نظر آ رہا تھا، لہٰذا چور چپڑاسی تھا۔

1- طوبیٰ عمر، لاہور	2- عاشر علی کمبوہ، پتوکی
3- محمد صہیب امین، جھنگ	4- محمد اورنگ زیب خان، کندیاں
5- صباحت فاطمہ، حویلی لکھا	

''کم بخت بجلی کو بھی اب ہی جانا تھا۔'' آمنہ نے غصے سے ریموٹ کو اُٹھا کر میز پر پٹخ دیا۔ پھر اُٹھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول ڈالے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لو اور حبس نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ گرمی کی شدت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دن بھی جب بجلی معمول سے ہٹ کر چلی گئی تو آمنہ کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتی تھی۔ اس کے والدین اس کو بہت سمجھاتے مگر اس کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ وہ کمرے سے نکلی اور غصیلے لہجے میں چیخی: ''او...... رحیم...... کدھر ہے تو...... اِدھر آؤ۔''

''جی چھوٹی بیگم صاحبہ...... کیا بات ہے؟'' ملازم بھاگا بھاگا آیا۔

''بے وقوف جا کر دیکھ یو پی ایس کو کیا ہوا ہے۔'' آمنہ نے غصے سے کہا۔ ''چھوٹی بیگم صاحبہ...... وہ خراب ہو گیا ہے۔'' رحیم نے ادب سے کہا۔ ''تو کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے، جا کر کسی الیکٹریشن کو بلاؤ۔'' آمنہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا ہے...... آمنہ کیوں گھر کو سر پہ اُٹھا رکھا ہے۔'' آمنہ کی والدہ بولیں۔ ''اماں! بجلی کو بھی اس وقت ہی جانا تھا...... زندگی عذاب بنا رکھی ہے اس گرمی نے۔'' آمنہ بولی۔

''تو اس میں چیخنے والی کون سی بات ہے۔ کیا ہو گیا اگر بجلی چلی گئی ہے۔'' ''اماں یو پی ایس بھی خراب ہو گیا ہے...... مجھ سے نہیں ہوتی گرمی برداشت۔'' آمنہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ہزار مرتبہ کہا ہے...... ناشکری مت کیا کرو...... تم تو ہر بات میں ناشکری کرتی ہو...... اللہ بہت ناراض ہوتا ہے...... تم نے کبھی غریب اور نادار لوگوں کو نہیں دیکھا جو گرمی کی جان لیوا تپش میں بیٹھے ہوتے ہیں، ان کے پاس پنکھے کی سہولت تک میسر نہیں آتی۔'' امی نے لیکچر ہی جھاڑ دیا۔

''اچھا...... اماں بس کریں۔ آپ تو ہر وقت ہی لیکچر دیتی رہتی ہیں...... اگر غریبوں کو اللہ نے آسائشات نہیں دیں تو اس میں میرا کیا قصور۔'' آمنہ نے بدتمیزی سے کہا۔ ''خدا تجھے سمجھ دے...... پتا نہیں کب سمجھے گی۔'' امی فکرمندانہ لہجے میں بولیں۔ پیچھے سے آمنہ کا بھائی بولا: ''امی! اس شیطان کی خالہ کو کبھی کوئی بات سمجھ نہیں آنی...... ویسے بھی شیطان کو اللہ تعالیٰ عقل نہیں دیا کرتے۔'' ''اچھا...... اگر میں شیطان کی خالہ ہوں تو آپ اس کے ماموں لگے...... جسے اپنی بہن کو تنگ کرنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں آتا۔'' آمنہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ امی دونوں کی بات سن کر ہنس پڑیں۔ پھر بولیں۔ ''بُری بات آصف! چھوٹی بہنا کو تنگ نہیں کرتے۔'' آمنہ بُرا سا منہ بنا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ والدہ کی یہ خواہش تھی کہ آمنہ ناشکری

کی عادت کو چھوڑ دے جو کہ اس میں پروان چڑھتی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اسے کئی مرتبہ سرسری سمجھایا بھی مگر اس کو کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس دفعہ انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اسے ضرور اچھی طرح سمجھائیں گی۔ چناں چہ وہ شام کے وقت اس کے کمرے میں گئیں۔ "آمنہ بیٹی! کیا کر رہی ہو؟" "کچھ نہیں، کیا آپ مجھے پھر سمجھانے آئی ہیں..... پلیز! آپ نہ سمجھایا کریں، مجھے سب معلوم ہے۔" آمنہ بولی۔ "سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود تم نے اس طرح کا رویہ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟" امی بولیں۔

"اوہ! امی..... آپ کیا چاہتی ہیں؟" آمنہ نے بیزاری سے کہا۔ "دیکھو آمنہ! سمجھانے کا مقصد یہ ہے کہ تم سدھر جاؤ۔ اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس گرمی کے موسم میں پانی تک کی سہولت موجود نہیں ہوتی مگر وہ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں..... اور سردیوں کے موسم میں ان کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے نہیں ہوتے۔ ہمیں اس بات کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ہر طرح کی سہولتیں اور آسائشات سے نوازا ہے، اس بات پر غرور ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ ہم پر یہ وقت آ جائے تب ہمیں ان نعمتوں کی قدر یاد آئے گی اس لیے ہمیں ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔" "اچھا ٹھیک ہے..... ہر دفعہ آپ یہی کہتی ہیں۔" آمنہ نے تنگ آ کر کہا۔ "سمجھ تو تمہیں پھر بھی نہیں آئی..... چاہے کتنے ہی بڑے لیکچر دے دیئے جائیں۔" امی غصے سے بولیں، پھر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اسی طرح دن گزرتے گئے مگر آمنہ کی ناشکری کی عادت میں ذرہ برابر کمی نہ آئی۔

ایک دن آمنہ کمرے میں بیٹھی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ بجلی معمول کے مطابق گئی ہوئی تھی، وہ برقی پنکھے کی گرم ہوا جو کہ گرمی کی شدت کو کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی بجلی آئی اے سی چل پڑا۔ آمنہ اٹھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ بند کرنے کے لیے آگے بڑھی۔ ابھی وہ کھڑکی بند کر ہی رہی تھی کہ اس کی نظر ایک خستہ حال جھونپڑی پر پڑی جو خشک گھاس پھوس اور پرانے کپڑوں سے ڈھکی تھی۔ وہاں ایک عورت ننھے سے بچے کو اپنی آغوش میں سمیٹے بیٹھی ہوئی تھی۔ بچہ گرمی کی شدت سے بلک رہا تھا مگر ماں اس قدر بے بس تھی کہ وہ بچے کو ٹھنڈی ہوا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کھجور کے خشک پتوں سے بنی پنکھی سے بچے کو ہوا دے رہی تھی۔ اس عورت کے قریب ہی ایک اور بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ تینوں ہی پسینے سے شرابور تھے اور تپتی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، پھر بچہ اٹھا اور جھونپڑی کے اندر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ سر پہ ٹھنڈے شربت کا خوانچہ لیے زندگی کی تلاش میں نکلا اور پوری طاقت صرف کر کے "ٹھنڈا شربت لے لو" کی صدا بلند کرنے لگا۔

آمنہ کافی دیر یہ دکھی منظر دیکھتی رہی۔ اس کے سامنے اپنی ناشکری کے کلمات گردش کرنے لگے جو وہ ہر بات پہ بولتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی حالت بھی اس غریب بچے جیسی ہوتی تو اس پر کیا بیتتی۔ اس جھونپڑی سے کچھ ہی دور کچی بستی بھی تھی جہاں کئی خستہ حال مکان اور جھونپڑیاں تھیں۔ وہاں چھوٹے چھوٹے بچے گرمی کی شدت اور ننگے پیر کے باوجود کھیل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی ملی جلی کیفیت عیاں تھی۔ ان کے اس اطمینان سے زندگی کی رمق دکھائی دے رہی تھی جس نے آمنہ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اللہ نے ان لوگوں کو بہت سی سہولتوں اور نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے جو ان کی مفلسی سے ظاہر ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود وہ مطمئن اور خوش دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک میں ہوں جسے خدا کی عطا کردہ تمام سہولتیں اور نعمتیں میسر ہیں لیکن اس کے باوجود میں کتنی ناشکری ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے کبھی ایسا اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ دراصل مفلس تو میں ہوں جس کے پاس دل کے اطمینان کی دولت نہیں ہے۔ ان بچوں کے چہروں پر اطمینان نے اسے شکر کی تصویر دکھلا دی۔ آمنہ کو اس کی والدہ کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ یہ عزم کر کے کھڑکی سے ہٹی کہ آئندہ وہ کسی بھی بات پر ناشکری نہیں کرے گی۔ اس نے دل میں اس بات کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے اسے جلد ہی اس کی غلطی کا احساس دلا دیا اور مزید ناشکری سے بچا لیا۔ ابھی وہ کھڑکی سے ہٹی ہی تھی کہ بجلی ایک دفعہ پھر چلی گئی مگر اس دفعہ آمنہ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ وہ بستر پر دم سادھے بیٹھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئی جہاں اس کی والدہ اور بھائی بیٹھے گفت و شنید کر رہے تھے۔ آمنہ کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر آصف شریر لہجے میں بولا: "کیا ہوا شیطان کی خالہ کو..... بڑی خاموش دکھائی دے رہی ہے..... اور آج تو معمول کے مطابق کوئی داویلا سنائی نہیں دے رہا۔" "آج کے بعد شیطان کی خالہ کبھی داویلا نہیں کرے گی۔" آمنہ مسکرا کر بولی۔ "اوہ..... ہو..... یہ انقلاب کب آیا۔" آصف نے حیران ہو کر کہا مگر اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ "جب مجھے غریب کا خدا یاد آیا۔" آمنہ نے کہا اور ان کی والدہ مسکرا دیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

اُٹھے گا اور نہائے گا — اللہ کی حمد سنائے گا
کش مش کے مزے اُڑائے گا — پھر خوب سویاں کھائے گا
گھر بھر سے عیدی پائے گا
مٹھو بھی عید منائے گا

ننھی کے پاس یہ جاتا تھا — گڈو کو روز جگاتا تھا
پھر سحری کھانے آتا تھا — سحری میں چوری کھاتا تھا
اب دن بھر چونچ ہلائے گا
مٹھو بھی عید منائے گا

شربت سے اس کی یاری تھی — چنے کی چاٹ بھی پیاری تھی
حلوا اس کی افطاری تھی — روزوں میں کیا سرشاری تھی
سب لوگوں کو بتلائے گا
مٹھو بھی عید منائے گا

جب گڈو باہر جائے گا — کاندھے پہ اُڑتا آئے گا
پھر اس کا جی للچائے گا — قلفی سے جی بہلائے گا
جی بھر کے جھولے کھائے گا
مٹھو بھی عید منائے گا

ریاض عادل

''ارے راحیل! آپ یہاں چھپ کر کیا کھا رہے ہیں؟'' اچانک ہی میٹھے میاں راحیل کو ڈھونڈتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے تو اسے بستر کے پیچھے کچھ کھاتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ راحیل نے جب میٹھے میاں کو دیکھا تو پلیٹ چھپاتے ہوئے گھبرا کر بولا۔ ''کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔''

''اوہو! تو یہ حلوہ ہے۔'' میٹھے میاں راحیل کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے۔

''چپ یار مرواؤ گے کیا؟'' راحیل مزید گھبرا گیا۔

''کیا مطلب؟ کیا چچی جان کو پتا نہیں آپ یہاں حلوہ کھا رہے ہیں۔''

''ہاں یار، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' راحیل کھسیانا ہو گیا۔

''مگر چوری کرنا تو بُری بات ہے۔'' میٹھے میاں نے تنبیہی انداز میں کہا۔

''اوہ یار میٹھے! ہر وقت نصیحت نہ کیا کرو، یہ ہماری اپنی چیز ہے کسی ہمسائے کا حلوہ نہیں ہے۔''

''لیکن راحیل آپ کے والدین کو تو پتا نہیں ہے نا اور اگر یہ چوری نہیں ہے تو آپ چھپ کر کیوں کھا رہے ہیں سب کے سامنے کیوں نہیں......'' ابھی میٹھے میاں کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ راحیل نے تیز لہجے میں اسے ٹوک دیا۔ ''اچھا اچھا، مسٹر ناصح! اپنی نصیحت اپنے پاس ہی رکھیے۔'' یہ کہہ کر وہ غصے میں باہر نکل گیا اور میٹھے میاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔ ......☆......

''نازش! جلدی چلو، اگر راحیلہ باجی نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ اپنی سینڈل ابھی میرے پیروں میں سے نکال لیں گی۔'' شکیلہ نے تیز تیز قدموں سے ٹی وی لاؤنج عبور کرتے ہوئے کہا۔

''شکیلہ! آپ کہاں جا رہی ہیں اور وہ بھی اس طرح چھپ کر۔'' کھٹے میاں نے لاؤنج میں پڑے صوفے پر سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو شکیلہ کے اٹھتے قدم رُک گئے۔ ''آپ سے مطلب؟''

''نہیں، ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ آپ اپنی دوست سے جو کہہ رہی تھیں کہ راحیلہ باجی کے سینڈل ہیں، تو کیا آپ نے ان سے اجازت لیے بغیر یہ سینڈل پہنے ہیں؟'' کھٹے میاں نے حیرت سے سوال یہ سوال کیا تو وہ بھنا اٹھی۔

''دیکھو کھٹے میاں! اپنے کام سے کام رکھو اور اپنی بہن کے سینڈل پہننے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔''

''نہیں شکیلہ! خواہ آپ کی اپنی بہن کے جوتے ہیں مگر بغیر

اجازت کسی کی چیز لینا چوری کہلاتا ہے۔ ایک مرتبہ قبیلہ قریش کے ایک معزز خاندان کی کسی عورت نے چوری کی تھی، سب نے رسول پاکؐ سے کہا کہ آپ اسے معاف کر دیں کیوں کہ اگر اس کا ہاتھ کاٹ دیا تو خاندان کی بڑی بدنامی ہوگی مگر حضرت محمدؐ نے فرمایا: خدا کی قسم اگر فاطمہؓ بھی چوری کرتیں تو میں ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔''

''دیکھو کھٹے میاں! اس وقت ہم کسی تقریب میں جا رہے ہیں، آپ کی نصیحتیں پھر کبھی سنیں گے۔'' شکیلہ نے کھسیانے انداز میں بات ختم کرنا چاہی۔

''لیکن شکیلہ! کھٹے میاں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ چوری تو چوری ہوتی ہے۔'' نازش پر کھٹے میاں کی باتوں کا بہت اثر ہوا تھا۔

''اوہو نازش! بس اب چلو، ویسے بھی دیر ہو رہی ہے۔'' شکیلہ شرمندگی مٹانے کے لیے نازش کو گھسیٹ کر باہر لے گئی اور کھٹے میاں اپنے کندھے اچکا کر رہ گئے۔

''یہ کھٹے میاں کون ہیں شکیلہ؟'' نازش نے پوچھا تو شکیلہ بُرا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

''ہمارے تایا ابو اچھے میاں اور تائی امی پیاری خاتون کے دو جڑواں بیٹے ہیں کھٹے میاں اور میٹھے میاں، یہ سب شاداب نگر سے راحیلہ باجی کی شادی میں شرکت کے لیے پرسوں آئے ہیں مگر جب سے آئے ہیں، پوری فیملی نصیحتوں کا پٹارا کھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، وہ بات گناہ ہے یہ بات بُری ہے۔ اُف! میرا تو دم گھٹنے لگا ہے اپنے ہی گھر میں۔''

''لیکن شکیلہ بات تو ٹھیک کی ہے کھٹے میاں نے۔'' نازش بولی۔

''اُف! اب تم بھی بڑی بی بن گئیں میری۔'' شکیلہ کو مزید غصہ آنے لگا مگر نازش کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''اچھا بابا! اب غصہ تھوک دو اور جلدی چلو شبنم انتظار کر رہی ہوگی۔'' ......☆......

''ارے شکیل! یہ کھلونا موبائل تو آپ کا بہت خوب صورت ہے۔'' پیاری خاتون نے ننھے شکیل کو موبائل سے کھیلتے دیکھا تو پیار سے اس کے کھلونے کی تعریف کر ڈالی۔

''جی تائی امی، اس میں مختلف لائٹس جلتی ہیں اور دیکھیں کتنے پیارے پیارے گانے اور میوزک ہے اس میں۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''ارے واہ! کیا ابو نے دلوایا ہے۔'' وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ ''نہیں تائی امی۔''

''تو پھر کسی نے تحفہ دیا ہوگا۔'' وہ ہنس کر بولیں۔ ''نہیں تو، یہ میرے دوست کا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''اچھا تو پھر دوست نے کھیلنے کے لیے دیا ہوگا۔''

اس بات پر شکیل خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب پیاری خاتون کا ماتھا ٹھنکا اور تھوڑی ہی دیر بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ ننھا شکیل چوں کہ اس کھلونا موبائل کو بہت پسند کرتا ہے، لہٰذا وہ اسے چرا کر لے آیا ہے۔

''بیٹا! یہ تو بہت بُری بات ہے کسی کی چیز چوری کرنے سے اللہ اور ہمارے نبی حضرت محمدؐ بہت ناراض ہوتے ہیں۔''

''مگر میں کھیل کر اسے واپس کر دوں گا۔'' شکیل نے کہا۔

پیاری خاتون جانتی تھیں کہ کوئی بچہ جس چیز کو چوری کرتا ہے، وہ اسے کبھی واپس نہیں کرتا، لہٰذا انہوں نے اسے سمجھایا۔ ''بیٹا! اوّل تو بغیر اجازت کسی کی بھی چیز لینا بہت بڑا گناہ ہے، پھر اسے اپنے پاس رکھنا اور زیادہ بُری بات ہے، لہٰذا اسے ابھی اپنے دوست کو واپس کر دیں۔'' شکیل نے وعدہ کیا کہ وہ اسے ابھی جا کر اپنے دوست کو دے آئے گا۔ پیاری خاتون نے اسے پیار کر کے شاباش دی۔ ......☆......

راحیل کسی الیکٹریشن کے ساتھ کھڑا بجلی کی تاروں کو کھمبے سے ڈائریکٹ منسلک کروا کے شادی کے گھر میں چراغاں کا اہتمام کروا رہا تھا کہ اچھے میاں کو خبر ہو گئی۔ ''بیٹا راحیل! یہ تو بہت ہی غلط بات ہے، اگر واپڈا والوں کو خبر ہو گئی تو جرمانے کے ساتھ جیل بھی جانا پڑے گا۔'' ''نہیں، تایا ابو! واپڈا والوں اور لائن مین سے ہماری دوستی ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''بیٹا! اگر کسی نے حساس اداروں کو اطلاع دے دی تو بہت بُرا ہوگا۔'' ''نہیں، تایا ابو! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم اکثر ایسا کرتے ہیں حتیٰ کہ ہر عید میلاد النبیؐ پر ہمارا گھر اور دُکان سب سے زیادہ بقعۂ نور بنی ہوتی ہے کیوں کہ ہم بہت خوب صورت لائٹنگ کرتے ہیں۔'' اس مرتبہ راحیلہ نے خوش ہو کر فخر سے بتایا تو اچھے میاں کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ اپنے چھوٹے بھائی کے گھر کے ماحول کو دیکھ کر سخت پریشان تھے۔ سب سے دکھ کی بات ان کے لیے یہ تھی کہ وہ اپنی

غلطیوں کو بہت معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ انہیں قطعاً احساس نہیں تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے گناہ مل کر ان کی زندگی اور عاقبت خراب کر رہے تھے۔ اسی رات کھانے کے بعد جب سب مل کر راحیلہ کی کل کی مہندی کے پروگرام کو فائنل کر رہے تھے تو اچھے میاں نے اپنے چھوٹے بھائی چاند میاں کو مخاطب کیا۔

''چاند میاں! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں، ہر چیز میں اس قدر اسراف، بجلی کی چوری اور بچوں کا ہر کام والدین کو بتائے بغیر چوری چھپے کرنا، یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟''

''ارے اچھے بھیا! چھوڑیئے ناں، اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ دنیا ترقی کر گئی ہے، اقدار بدل گئی ہیں۔ بچے ہماری کہاں سنتے ہیں۔'' چاند میاں لاپروائی سے بولے۔ ''نہیں چاند میاں! بچوں کو سمجھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور حضرت محمدؐ کے اُمتی ہیں۔ مرنے کے بعد ہمیں اپنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔'' اچھے میاں دکھ سے بولے۔

''زمانہ نہیں بدلا بلکہ ہم سب کے خیالات بدل گئے ہیں۔ ہر غلط بات اور گناہ کو معمولی بات سمجھنا، غیر اللہ کو دعوت دینے والی بات ہے۔'' اس مرتبہ پیاری خاتون نے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بڑے بھیا اور پیاری بھابی مگر اب پانی سر سے اُونچا ہو گیا ہے۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔'' راحیل کی والدہ ڈبڈبائی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ بولیں۔

''نہیں، دل چھوٹا نہیں کرتے، ابھی بھی وقت ہے بچوں کی بہترین تربیت ہو سکتی ہے۔'' انہوں نے حوصلہ دیا اور اچھے میاں نے شکیلہ، شکیل، راحیلہ اور راحیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بچو! جھوٹی آن بان شان کے لیے اور اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے چوری کرنا، دوسروں کو نقصان پہنچانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور تقریبات پر اسراف کرنا، گناہ ہے۔

رسول پاکؐ نے فرمایا: ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ والدین کی نافرمانی بربادی کرو، فضول خرچی کرنے والا شیطان کا بھائی ہے۔ آپؐ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی انتہائی سادگی سے کر کے ہم سب کے لیے بہترین مثال قائم کر دی، اور بیٹا! جس ہادی برحق سرورِ کونین حضرت محمدؐ کے لیے آپ عید میلاد النبیؐ کی تقریبات پر جس طرح کنڈے ڈال کر بجلی چوری کر کے چراغاں کرتے ہیں، حضرت محمد ﷺ نے ہمیشہ سادگی کا درس دیا اور چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔'' پیاری خاتون کے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

راحیل نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن تائی امی! بجلی تو حکومت کی ہے، ہم نے کسی کے گھر سے چوری نہیں کی۔''

''بیٹا! چوری تو چوری ہوتی ہے اور حکومت بھی تو ہماری اپنی ہے، نقصان تو سب کا ہوتا ہے۔''

''سوری تایا ابو! اور تائی امی!'' اس مرتبہ راحیل کے ساتھ راحیلہ، شکیلہ اور شکیل بھی شرمندگی سے بولے تو اچھے میاں اور پیاری خاتون نے انہیں پیار سے گلے لگا لیا۔

''کھٹے بھائی اور میٹھے بھائی آپ دونوں بھی ہمیں معاف کر دیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ ایسی غلطیاں نہ دہرائیں اور سیرۃ النبیؐ پر عمل کر کے سچے مسلمان بن سکیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو گا، اپنے دوستوں میں بھی سیرت النبیؐ کو عام کریں گے۔''

''وہ..... کیا کہتے ہیں، صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ہیں نا پیاری امی؟'' میٹھے میاں سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنی والدہ سے مخاطب ہوئے تو سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ چاند میاں اور چاندنی بیگم کی آنکھوں میں تشکر کی نمی اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ☆☆☆

عظیم باکسر محمد علی

بیسویں صدی کے عظیم ترین کھلاڑی محمد علی گزشتہ دنوں انتقال کر گئے اور اپنے کروڑوں مداحوں کو سوگوار کر گئے۔ عظیم باکسر محمد علی 17 جنوری 1942ء میں امریکی ریاست کینٹکی کے شہر لوئسویل میں عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1964ء میں اسلام قبول کرنے سے قبل ان کا نام کیسئس مارسیلس کلے جونیئر تھا۔ محمد علی کو شہرت اس وقت ملی جب 1960ء میں روم میں ہونے والے اولمپکس مقابلوں میں انہوں نے سونے کا تمغہ جیتا لیکن سیاہ فام ہونے کی وجہ سے انہیں ملازمت سے محروم رکھا اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا جس سے دلبرداشتہ ہو کر انہوں نے اپنا سونے کا تمغہ دریا میں پھینک دیا اور اپنے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کی وجہ سے باکسنگ کو پروفیشنل انداز میں اپنانے کا فیصلہ کیا۔ باکسنگ میں ان کا پروفیشنل کیریئر تقریباً 21 سالوں پر محیط رہا جس میں انہوں نے 61 مقابلوں میں سے 56 مقابلے جیتے جبکہ 35 حریفوں کو ناک آؤٹ کیا۔ محمد علی کے خاندان کا کہنا ہے کہ ان کی موت سیپٹک شاک سے واقع ہوئی۔ وہ سانس کی تکلیف کے باعث امریکی ریاست ایریزونا کے شہر فینکس کے ایک اسپتال میں داخل تھے۔ انہیں پارکنسنز کا مرض لاحق تھا جس کی وجہ سے ان کی سانس کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور اس بیماری کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔

کیٹی نے سٹ پٹا کر کہا۔ ''توبہ توبہ! اس جن کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ کبھی چٹکی بجانے سے میں آدھا مرد اور آدھا جانور بن جاتی تھی اور اب تو وہ جن بھی ایک مدت سے غائب ہے۔ کئی بار چٹکی بجائی مگر وہ نہیں آیا۔''

تھیو نے مذاق میں کہا۔ ''کیٹی! اب چٹکی بجا کر دیکھو۔ شاید وہ جن یہاں آ جائے اور ہمیں جولی سانگ کے بارے میں کچھ بتا دے۔''

کیٹی بولی۔ ''نہ بھائی میں چٹکی نہیں بجاؤں گی۔ کیا پتا چٹکی بجاتے ہی بندریا بن جاؤں۔ مجھے جن کی چٹکی پر کوئی بھروسا نہیں رہا۔''

جب تھیو سانگ نے بار بار جولی سانگ کا ذکر کیا تو کیٹی نے کہا۔

''تمہاری اور جولی سانگ کی خاطر میں چٹکی بجا کر دیکھ لیتی ہوں۔''

کیٹی نے چٹکی بجا دی۔ چٹکی بجانے پر کچھ نہ ہوا۔ کیٹی نے کہا۔ ''دیکھا، میں نہ کہتی تھی کہ کچھ نہیں ہو گا۔ وہ جن جو میرا دوست تھا، کہیں جا چکا ہے۔''

تھیو سانگ نے کہا۔ ''چٹکی بجا کر اسے آواز دو۔''

کیٹی نے چٹکی بجا کر اسے آواز دی۔ ''میرے دوست جن! تم اگر میری آواز سن رہے ہو تو میرے پاس آؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

اب کیٹی کے پرانے دوست جن کی آواز سنائی دی۔ آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں میں سے آ رہی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق جن دوست اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی جھنجلایا ہوا تھا۔ جن بولا۔

''کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے؟''

کیٹی نے غصے سے کہا۔ ''اتنی دیر بعد تم سے بات کی ہے اور تم اب بھی سٹ پٹائے ہوئے ہو۔''

جن دوست کی آواز آئی۔ ''کیٹی! میرے پاس تمہاری باتیں سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔ فوراً بتاؤ کیا چاہتی ہو؟''

کیٹی نے کہا۔ ''مجھے تمہاری چٹکی پر اعتبار نہیں رہا۔ میں کوئی ایسی طاقت چاہتی ہوں جو اپنی جگہ پر مکمل طاقت ہو، جس طرح کہ عنبر ناگ، ماریا، جولی سانگ اور تھیو سانگ کے پاس اپنی اپنی طاقت موجود ہے۔''

جن دوست نے تلخ آواز میں کہا۔ ''کیٹی! میں نے تمہارا کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ اگر تمہیں میری چٹکی پر بھروسا نہیں رہا تو نہ سہی جاؤ، جو چاہے کرو۔''

تھیو سانگ خاموشی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جن اور کیٹی ایک دوسرے کے دوست بھی ہیں لیکن ایک دوسرے سے لڑائی بھی خوب کرتے ہیں۔ کیٹی بولی۔ ''میں تمہارے بغیر کیا کر سکتی ہوں؟ تم جن ہو۔

مجھے بھی کوئی زبردست طاقت دو تاکہ میں بھی کہہ سکوں کہ میرے پاس بھی یہ طاقت ہے۔''

جن دوست کی آواز آئی۔''تو پھر دجلہ و فرات کی وادی میں ایک شہر بابل ہے۔ وہاں جاؤ۔ اس شہر بابل کے جنوب میں دریا کے کنارے ایک پُرانا مینار ہے۔ اس مینار کے نیچے ایک شکستہ تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے میں تمہیں ایک عورت کا بت زمین میں کمر تک دھنسا ہوا ملے گا۔ اس بت کے آگے جا کر میرا نام لینا۔ وہ ایراوتی دیوی کا بت ہے۔ وہی تمہیں کوئی طاقت دے سکتی ہے۔ اب اس کے بعد مجھے تنگ نہ کرنا، میں جا رہا ہوں۔ تم جانو تمہارا کام......''

کیٹی نے پوچھا۔''تمہارا نام کیا ہے؟ مجھے تو آج تک معلوم نہیں ہوا؟'' مگر اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ جن دوست جا چکا تھا۔ تھیو ساگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تمہارا یہ جن دوست ویسا ہی بد دماغ ہے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا لیکن تمہیں مبارک ہو۔ اب تمہیں بھی ہماری طرح کوئی طاقت ملنے والی ہے۔''

کیٹی نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔''مجھے اس بد دماغ جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔''

تھیو ساگ کہنے لگا۔''لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں بابل کے شہر میں ایراوتی دیوی کے پاس ضرور جانا چاہیے۔ اسی بہانے ہم عنبر ناگ ماریا اور جولی ساگ کو بھی وہاں تلاش کر لیں گے۔''

کیٹی بولی۔''ٹھیک ہے چلے چلیں گے مگر پہلے جولی ساگ کو یہاں تو ڈھونڈا جائے۔''

تھیو ساگ اور کیٹی اس وقت قبروں میں کھڑے تھے۔ تھیو ساگ بولا۔''ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ تمہارے جن دوست سے جولی ساگ کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔''

کیٹی سر کو جھٹک کر بولی۔''اس سے پوچھنا بے کار تھا۔ وہ کچھ نہیں بتایا کرتا۔'' تھیو ساگ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔''یہاں تو قلعے کے کھنڈر میں مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس سے یہ ثابت ہو کہ یہاں کوئی انسان بھی رہتا ہے۔ ہمیں پہلے تو نجومی پانڈو کو ڈھونڈنا ہوگا۔ وہ ملے تو جولی ساگ کا کوئی سراغ مل سکے گا۔''

کیٹی اور تھیو ساگ اس طرح باتیں کرتے قلعے کے کھنڈروں سے نکل کر اس طرف آ گئے جہاں اصطبل کی ٹوٹی پھوٹی دیوار تھی۔ کیٹی نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''وہاں مجھے کوئی گڑھا کھدا ہوا نظر آتا ہے۔'' تھیو ساگ اور کیٹی دیوار کے پاس اس جگہ پہنچ گئے جہاں گڑھے میں سے پانڈو نجومی خزانہ نکال کر لے گیا تھا۔ اگرچہ اس نے گڑھے کو بند کر کے اوپر گول پتھر رکھ دیا تھا لیکن باہر ابھی تک تازہ مٹی پڑی تھی۔ تھیو ساگ نے جھک کر مٹی کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔''لگتا ہے یہاں کسی نے گڑھا کھودا اور پھر اسے مٹی سے بھر دیا ہے۔''

کیٹی بولی۔''اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کسی نے گڑھا کھودا اور بھر دیا۔ بس......''

تھیو ساگ نے مٹی میں سے ایک چمکتا ہوا موتی اٹھا لیا اور کیٹی کو دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔''یہ ایک قیمتی چیز ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس گڑھے میں ضرور کوئی خزانہ دفن تھا جسے نکال لیا گیا ہے اور یہ موتی اس خزانے میں سے نکل کر یہاں گرا ہے۔''

کیٹی موتی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ پانڈو نجومی اسی خزانے کی تلاش میں یہاں آیا ہو اور خزانہ نکال کر لے گیا ہو۔''

تھیو ساگ سوچ رہا تھا۔ بولا۔''ممکن ہے جولی ساگ کو اس نے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ جولی ساگ کو طلسم کے زور سے اپنے قابو میں کر کے پانڈو نجومی نے اس خزانے کا راز معلوم کیا ہو اور پھر جولی ساگ اور خزانے کو لے کر یہاں سے چل دیا ہو۔''

کیٹی نے کہا۔''تو پھر ہمیں واپس واراناسی شہر جا کر جولی ساگ کو دیکھنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے پانڈو نجومی خزانے اور جولی ساگ کے ساتھ اپنی حویلی میں جا چکا ہو۔''

تھیو ساگ نے چند قدم آگے چل کر زمین پر جھک کر ایک دوسرا موتی اُٹھا لیا اور بولا۔''یہ بھی خزانے کا موتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانڈو نجومی جولی ساگ اور خزانے کو لے کر واپس اپنی حویلی کی طرف نہیں بلکہ مغرب کی طرف گیا ہے۔ ہمیں اس طرف چلنا چاہیے۔''

کیٹی اور تھیو ساگ نے جنگل میں مغرب کی طرف گھوڑے بڑھا دیئے۔ کچھ روز چلنے کے بعد ریتلی زمین آ گئی۔ یہاں انہیں چار گھوڑوں کے پاؤں کے نشان ملے۔ تھیو ساگ گھوڑے سے اُتر

کر ان نشانوں کو دیکھنے لگا۔ ''کیتی! یہ چار گھوڑوں کے پاؤں کے نشان ہیں۔ ان میں ایک گھوڑے کے پاؤں کے نشان ریت میں زیادہ گہرے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اس گھوڑے پر بوجھ لدا ہوا تھا اور یہ بوجھ خزانے کا ہی ہو سکتا ہے۔''

''کیتی نے پوچھا۔''اور باقی گھوڑوں پر کون سوار ہو سکتے ہیں؟''

تھیو سانگ بولا۔ ''ظاہر ہے ایک گھوڑے پر پانڈو نجومی اور دوسرے گھوڑے پر جولی سانگ سوار ہو گی اور تیسرے گھوڑے پر سفر کا سامان لدا ہوا ہو گا۔ کیتی پر تھیو سانگ کی باتوں کا اثر ہو رہا تھا۔ کہنے لگی۔ ''گھوڑوں کے سموں کے نشان بھی مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمیں ان کا تعاقب کرنا چاہیے کیوں کہ ایک بات ثابت ہو گئی ہے کہ پانڈو اور جولی سانگ یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ آگے گئے ہیں۔''

تھیو سانگ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہم اس سے بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پانڈو نجومی خزانہ لے کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا بلکہ وہ جولی سانگ اور خزانے کو لے کر کسی دوسرے ملک بھاگ جانا چاہتا تھا۔'' کیتی کہنے لگی۔ ''اگر یہاں سے آگے سمندر بندرگاہ ہے تو پھر وہاں سے یہ پتا چل سکتا ہے کہ پانڈو نجومی ایک عورت کے ساتھ جہاز پر سوار ہوا تھا کہ نہیں؟''

جب یہ طے ہو گیا کہ پانڈو نجومی جولی سانگ کو لے کر واپس اپنی حویلی میں جانے کی بجائے آگے ساحل سمندر کی طرف گیا ہے تو تھیو سانگ اور کیتی نے جنگل میں مغرب کی طرف گھوڑے بڑھا دیے جدھر کالی کٹ کی بندرگاہ تھی۔ تھیو سانگ نے کیتی کو بتا دیا تھا کہ آگے کالی کٹ نام کی پرانی بندرگاہ موجود ہے اور وہاں پہنچ کر ہی وہ پانڈو اور جولی سانگ کے بارے میں مزید کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ سارا دن اور ساری رات سفر کرنے کے بعد تھیو سانگ اور جولی سانگ کالی کٹ شہر کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔

بندرگاہ پر کچھ بادبانی جہاز کھڑے تھے۔ ان پر سامان لادا جا رہا تھا۔ تھیو سانگ اور کیتی بندرگاہ کے پاس ہی بنی ہوئی ایک سرائے میں آ گئے۔ انہوں نے بندرگاہ پر جا کر معلوم کیا کہ ایک جہاز چند روز پہلے بصرہ کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا تھا جس میں بابل شہر کو جانے والے مسافر بھی سوار تھے۔ اس زمانے میں مسافروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے۔ تھیو سانگ نے بندرگاہ پر موجود ایک ملازم سے پوچھا کہ جہاز پر کتنے مسافر سوار تھے اور ان کے پاس کون کون سا سامان تھا۔ ملازم بولا۔

''ہم پورا حساب کتاب نہیں رکھتے۔ اندازہ ہے کہ جہاز پر ڈیڑھ سو مسافر تھے اور ان کے پاس عام سامان تھا۔''

کیتی نے جولی سانگ کا حلیہ بتاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اس حلیے کی کوئی عورت جہاز پر سوار ہوئی تھی؟''

ملازم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہاں یاد آیا، ایک سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی عورت جہاز میں سوار ہوئی تھی۔''

کیتی نے بے تابی سے پوچھا۔ ''اس کے ساتھ کوئی آدمی بھی تھا؟''

ملازم دماغ پر زور دے کر کہنے لگا۔ ''ہاں..... ایک کالے رنگ کا اونچا لمبا دبلا پتلا آدمی اس کے ساتھ تھا۔ یہ لوگ عین اس وقت آئے تھے جب جہاز چلنے والا تھا۔''

تھیوسانگ نے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ لوگ کس شہر کو جارہے تھے؟''

بندرگاہ کے ملازم نے کہا۔ ''اب یہ تو میں نہیں بتا سکتا لیکن وہ جہاز بصرے کی طرف گیا ہے۔ ظاہر ہے اس میں بصرے کے مسافر بھی ہوں گے۔ اس کے آگے بابل شہر کو جانے والے بھی مسافر جہاز میں ہوں گے۔''

تھیوسانگ نے کیٹی کی طرف دیکھ کر اپنی خلائی زبان میں کہا۔

''وہ کمینہ پانڈو نجومی جولی سانگ کو لے کر اسی جہاز پر گیا ہے۔ ہمیں بھی اگلے جہاز میں بصرے اور پھر بابل کی طرف چلنا ہوگا۔ بابل میں تم ایرادتی کی مورتی سے ملاقات بھی کر سکو گی۔''

کیٹی نے خلائی زبان میں جواب دیا۔ ''یہی مناسب لگتا ہے۔ اس سے معلوم کرو کہ اگلا جہاز بصرے کی طرف کب جائے گا۔''

جب تھیوسانگ نے اگلے جہاز کے بارے میں پوچھا تو بندرگاہ کے ملازم نے بتایا کہ اگلا جہاز ایک روز بعد شام کے وقت بصرے کی جانب روانہ ہوگا۔ کیٹی اور تھیوسانگ باتیں کرتے سرائے میں واپس آ گئے۔ تھیوسانگ کہنے لگا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اب ہم جولی سانگ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ یا تو بصرے میں اس مکار نجومی پانڈو کے ساتھ ہوگی یا پھر بابل میں..... میرا خیال ہے کہ پانڈو نجومی خزانہ حاصل کرنے کے بعد ان دو شہروں میں سے کسی ایک شہر میں آباد ہونا چاہتا ہے۔''

کیٹی نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ایک بار جولی سانگ ہمیں مل جائے۔ پھر اس کمینے نجومی پانڈو سے بھی نمٹ لیں گے۔''

ایک رات اور دن تھیوسانگ اور کیٹی نے بندرگاہ کی سرائے میں گزاری۔ وہ بندرگاہ پر آ گئے۔ گھوڑے انہوں نے وہیں فروخت کر دیئے تھے۔ بصرے کو جانے والا بادبانی جہاز بندرگاہ پر آ کر ساحل کے ساتھ لگ گیا تھا۔ سامان لادا جا رہا تھا۔ مسافر بھی سوار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تھیوسانگ اور کیٹی بھی کرایہ ادا کرنے کے بعد جہاز پر سوار ہو گئے۔ رات کے پہلے پہر میں ہوا چلنے لگی۔

جہازوں کا لنگر اٹھانے کے بعد کپتان کے حکم سے بادبان کھول دیئے گئے اور جہاز سمندر میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس زمانے میں جہازوں کی رفتار تیز نہیں ہوا کرتی تھی۔ بادبانی جہاز ہوتے تھے۔ اگر سمندر میں ہوا بند ہو جاتی تو جہاز ہوا کے انتظار میں وہیں سمندر میں رُک جاتا تھا۔ جب ہوا چلتی اور بادبانوں میں ہوا بھر جاتی تو وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ یوں سمندر میں سفر کرتے دس دن کے بعد یہ جہاز بصرے کی بندرگاہ کے ساتھ جا لگا۔

تھیوسانگ اور کیٹی بصرے کی ایک سرائے میں آ گئے۔ اس زمانے میں سرائیں ہوٹلوں کا کام دیا کرتی تھیں۔ یہاں کی فضا میں بھی عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ کی خوشبو نہیں تھی۔ کیٹی کہنے لگی۔

''جولی سانگ کی تو خوشبو روک دی گئی ہے مگر عنبرناگ ماریا کی خوشبو بھی اس شہر میں نہیں، جس کا مطلب ہے کہ وہ اس شہر میں نہیں ہیں۔''

تھیوسانگ بولا۔ ''لیکن ہم جولی سانگ کے ساتھ ساتھ انہیں بھی ڈھونڈ لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ ان کا بھی سراغ مل جائے۔''

دو دن تک کیٹی اور تھیوسانگ بصرہ شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں عنبرناگ ماریا اور خاص طور پر جولی سانگ کو تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے کئی ایک محلوں میں جا کر لوگوں سے پوچھا کہ کسی نے نیا مکان تو نہیں خریدا مگر انہیں کہیں سے بھی جولی سانگ اور عیار نجومی پانڈو کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیٹی کہنے لگی۔ ''تھیوسانگ! نجومی پانڈو کے پاس بے بہا خزانہ ہے۔ وہ تو شہر کے باہر کوئی عالی شان محل خرید کر رہ رہا ہوگا۔ اس شہر کے باہر جو محل بنے ہوئے ہیں وہاں چل کر دیکھنا ہوگا۔''

شہر کے باہر کچھ خوب صورت محل بنے ہوئے تھے۔ کیٹی اور تھیوسانگ نے ان کو بھی ایک ایک کر کے دیکھ لیا۔ یہاں بھی جولی سانگ انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ ایک ہفتہ بصرے میں رہنے کے بعد کیٹی اور تھیوسانگ نے شہر بابل کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں سے ایک قافلہ بابل شہر کی طرف جا رہا تھا۔ کیٹی اور تھیوسانگ اس قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہ قافلہ ویرانوں اور صحراؤں میں سفر کرتا ہوا ایک ہفتے کے بعد شہر بابل پہنچ گیا۔ آج سے تین ہزار برس پہلے بابل کا شہر بڑا خوب صورت اور آباد شہر تھا۔

(باقی آئندہ)

کائنات کا دُرِ یتیم

(حیا شیخ، نواب شاہ)

"مبارک ہو! آپ کے یہاں پوتا ہوا ہے۔" دادا کو خبر کی گئی۔ وہ خوشی سے اُٹھے اور گھر کی طرف دوڑے چلے گئے۔ چاند سے زیادہ خوب صورت، پنکھڑی سے زیادہ گلابی، معصوم سے بچے کو اُٹھایا لیکن اپنے یتیم پوتے کے لیے آنسو آنکھوں سے نکل گئے، پھر ہمت باندھی اور کہا: "میں اس کا نام وہ رکھوں گا جو دُنیا میں کسی نے نہیں رکھا۔" یہ بچہ جب دُنیا میں آیا تو باپ کا سایہ شفقت سر سے اُٹھ چکا تھا اور والد جیسی عظیم ہستی کی زیارت نہ ہو سکی۔ ماں کی محبتوں کے درمیان پروان چڑھنے لگا۔ ماں بھی عظیم ماں تھی جس نے خوب تربیت کی۔ بچہ جب چھ سال کا ہوا تو ماں اسے ننھیال لے گئیں۔ واپسی پر ایک جگہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ایک خادمہ بھی ساتھ تھی۔ سانسیں آہستہ آہستہ جانے لگیں۔ بچہ حسرت سے ماں کو تکتا رہا۔ ماں نے آخری بار پیار کرتے ہوئے جان خالق کے سپرد کر دی۔ خادمہ نے ماں کو دفنا دیا۔ بچہ مسلسل آنسو بہاتا رہا۔ خادمہ نے معصوم بچے سے گھر چلنے کا کہا، بچہ قبر سے لپٹ گیا اور روتے ہوئے کہا: "اماں تجھے پتا نہیں تھا تیرے سوا دُنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔" خادمہ بڑی مشکل سے گھر لے کر آئیں۔

دُرِ یتیم کی مشقتوں میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا۔ دادا نے پرورش کی ذمہ داری لے لی۔ دُرِ یتیم کو لگا مجھے باپ کی شفقت کا ایک حصہ مل گیا، مگر قسمت نے پلٹا کھایا اور آٹھ سال کے معصوم بچے کو دادا بھی چھوڑ کر چلے گئے۔

"بھتیجے مجھے معلوم ہے تمہارا کوئی نہیں ہے لیکن میں عیال دار چچا تمہاری کفالت کرنا چاہتا ہوں۔ جو ہم کھائیں گے وہی تمہیں کھلاؤں گا۔" چچا نے کہا۔ دُرِ یتیم چچا کے گھر چلے گئے۔ چچا کا ایک بڑا کنبہ تھا، جو کھانا سب کو ملتا وہ اس قدر کم ہوتا کہ بمشکل سب کھا پاتے۔ دُرِ یتیم ان مشقتوں کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔

معاشرے میں پھیلی بُرائیاں، بداخلاقیاں اور گمراہیں انہیں بہت محسوس ہوتیں، اس لیے وہ ایک غار میں عبادت کے لیے چلے جاتے۔ خلوت حاصل کرتے۔ ایک دن خالق کائنات نے ایک بڑا سہرا دُرِ یتیم کے سر پر سجا دیا اور حکم دے دیا کہ لوگوں کو بُرائی سے نکالو۔ اپنے رشتہ داروں کو میرا پتا بتاؤ۔" دُرِ یتیم نکل گئے۔ پہاڑ پر چڑھ کر دعوت دی۔ ظالم کفار بات نہ سنتے۔ دُرِ یتیم تو اوّل دن سے ہی مشقتوں کو سہہ رہے تھے، برداشت کر گئے۔ جب اپنوں نے بات نہ سنی تو سوچا پورے جزیرے میں ہی جنگ ہے، عداوت ہے، باہر نکل کر دعوت دوں۔ سب لوگوں کو جمع کیا اور دعوت امن کا پیغام دیا مگر سرکشی ان کی رگ میں تھی، بات سننے سے انکار کر دیا۔ پتھر پھینکے، تالیاں پیٹیں، سیٹیاں بجائیں، مذاق اُڑایا، اسی حالت میں آپ واپس ہوئے۔ جوتے خون سے رنگین تھے۔ دعا مانگی: "اے اللہ! میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنی بے بسی، کمزوری اور لوگوں میں ذلت اور رسوائی کی۔ اے ارحم الراحمین! تو ضعفاء کا رب ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے۔ کسی اجنبی بے گانے کے جو مجھے دیکھ کر ترش رو ہوتا ہے اور منہ چڑھاتا ہے یا کسی دشمن کے جس کو تو نے مجھ پر قابو دے دیا۔ اے اللہ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔" دُرِ یتیم کی اس دعا سے شانِ قہاری جوش میں آ گئی، پوچھا گیا۔ اگر آپ بولیں تو ان دونوں پہاڑوں کو ملا دیا جائے۔ دُرِ یتیم نے معاف کر دیا۔ وقت آہستہ آہستہ بیتتا رہا۔ دُرِ یتیم پر کچرا ڈال دیا جاتا، راستے میں کانٹے بچھائے جاتے، سجدہ کرتے تو اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی جاتی لیکن ان کی ہمت و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر کار تنگ آ کر ان کو اہل خانہ سمیت شعب بن ابی طالب میں قید کر دیا گیا۔ دشمنوں نے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ کوئی چیز فروخت نہ کی جاتی۔ ایک وقت آیا سب کچھ ختم ہو گیا۔ فاقہ پر فاقہ گزرنے لگے۔ بچے بلبلائے، روئے، تڑپے، پتے کھائے۔ اس طرح قید کو گزارا، ثابت قدمی کے ساتھ سہتے رہے۔ مادرِ وطن کی گلیاں تنگ ہو گئیں دشمن ہر وقت قتل کے درپے رہتے قتل کرنے کی روز روز نئی اسکیمیں بنائی

جاتی، آخرکار ہجرت یثرب کا ارادہ کرلیا۔ اسی رات کافر قتل کے لیے دریتیم کے دروازے پر کھڑے ہیں مگر اس ذات برحق نے دریتیم کو بآسانی اور حفاظت کے ساتھ نکال لیا۔ ہجرت کے بعد بھی دشمنوں نے سکون کا نام نہ لینے دیا۔ ہر روز جنگ پر آمادہ رہے۔ دریتیم کے دندان مبارک ٹوٹے، خود کے حلقے سر میں جا دھنسے، بے ہوش ہو گئے لیکن قدم نہ ڈگمگائے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب سارا مکہ فتح ہو گیا۔ جب دریتیم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکے میں داخل ہوئے تو ابوسفیان پکار اٹھے۔ ''کتنی بڑی بادشاہت ہے۔'' حضرت عباسؓ نے فرمایا: ''یہ بادشاہت نہیں نبوت ہے۔'' وہی دریتیم (ﷺ) جس پر لوگوں نے ستم ڈھائے اس نے کعبہ پر جھنڈا لہراتے ہوئے اعلان کر دیا۔ ''آج کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ میں نے سب کو معاف کر دیا۔''

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

حقیر

(محمد طارق، مری شاپنگ سنٹر)

چھک، چھک کرتی ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ رات کے کوئی بارہ بجے ہوں گے۔ فرقان بیگ کا تکیہ بنائے، چادر اوڑھے، نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ کوئی وزنی چیز اس کی ٹانگوں پر آپڑی ہے، اس نے جلدی سے منہ کو چادر سے باہر نکالا کہ ذرا دیکھے تو معاملہ کیا ہے۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا کیوں کہ ایک بیس، بائیس سالہ نوجوان اس کے برتھ کے ساتھ ٹیک لگائے، اپنا آدھے سے زیادہ دھڑ اس کی ٹانگوں پر رکھے گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ فرقان کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ٹانگیں کھینچیں، جس کی وجہ سے نوجوان کو زبردست جھٹکا لگا۔ اس کا سر برتھ سے جا ٹکرایا۔ چوٹ تو نہیں لگی البتہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے فرقان کو دیکھنے لگا۔ تم سے ہزار، بارہ سو کا ٹکٹ خریدا جا سکتا ہے لیکن سو پچاس مزید خرچ کر کے برتھ یا سیٹ نہیں ''بک'' کرائی جا سکتی۔ تم جیسے ''حقیر'' لوگ ہی ''دو پیسے'' بچانے کی خاطر اپنا اور دوسروں کا سکون برباد کرتے ہیں اور بھکاریوں کی طرح کسی کونے یا دروازے کے سامنے پڑے رہتے ہیں۔ فرقان اس نوجوان پر چڑھ دوڑا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ساری باتیں سنتا رہا۔ فرقان اس کی شرافت کو دیکھ کر دوبارہ بولا۔ ''خبردار! جو اب میرے برتھ کے ساتھ ٹیک لگائی، سمجھے......'' فرقان نے کھا جانے والی نظروں سے اس نوجوان کی طرف دیکھا جو اب بھی سر جھکائے بیٹھا تھا اور چادر اوڑھ کر دوبارہ سو گیا۔ صبح اٹھا تو دن کے آٹھ بج رہے تھے۔ ریل گاڑی میں بھی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ اس نے ایک زبردست انگڑائی لی اور آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سامنے والے برتھ پر تقریباً ''اسی سالہ'' ضعیف العمر شخص لیٹا ہوا تھا جو اس نوجوان سے باتوں میں مصروف تھا۔ نوجوان پر نظر پڑتے ہی رات والا واقعہ اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ اس نے حقارت بھری نظر نوجوان پر ڈالی جو اس بوڑھے سے باتوں میں مشغول تھا۔ ''حقیر لوگ......'' فرقان نے دل میں سوچا اور دوبارہ حقارت سے ناک سکیڑ لی۔

ایک ادھیڑ عمر شخص جس نے نظر کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں بریف کیس تھاما ہوا تھا، بابا جی سے مخاطب تھا۔ ''بابا جی! کھڑے ہو جاؤ، یہ ہمارا برتھ ہے۔'' فرقان بھی ان کی طرف متوجہ تھا، اب فرقان کی حقارت غائب ہو چکی تھی۔ ''بیٹھے رہیں بابا جی، اٹھنے کی ضرورت نہیں۔'' بابا جی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ نوجوان بیچ میں بول پڑا۔ ''کیوں ضرورت نہیں ہے اٹھنے کی......'' ادھیڑ عمر شخص بگڑتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے جناب کہ یہ برتھ میرا ہے۔ یہ رہا ٹکٹ اور اس پر درج برتھ نمبر، آپ خود تسلی کر سکتے ہیں۔'' نوجوان نے ٹکٹ ادھیڑ عمر شخص کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا یہ برتھ نمبر 20 اور ڈبہ نمبر 4 نہیں۔'' ادھیڑ عمر شخص نے سوالیہ نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''محترم یہ برتھ نمبر 20 ہی ہے مگر ڈبہ نمبر 3 ہے۔'' نوجوان نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''اوہ...... معاف کرنا۔'' ادھیڑ عمر شخص نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور آگے کی طرف بڑھ گیا۔ بابا جی بھی حیرت اور پیار سے اپنے محسن کو دیکھنے لگے جس نے ان پر ظاہر تک نہیں ہونے دیا تھا کہ یہ اس کا برتھ ہے اور ادھر فرقان مارے شرم کے پانی پانی ہو چکا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ حقیر نوجوان نہیں بلکہ وہ خود ہے۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

ایک تصویر کے دو رُخ

(شاہ زیب اثر، پشاور)

خالد اور وحید گہرے دوست ہیں کیوں کہ دونوں پڑوس میں ہونے کے علاوہ کئی سالوں سے ہم جماعت بھی رہے ہیں۔ اس لیے جیسے ہی خالد نے آج بازار جاتے ہوئے وحید کو دیکھا تو بلند آواز کے ساتھ کہا۔ ''السلام علیکم! وحید۔'' ''وعلیکم السلام! سناؤ دوست کیا حال احوال ہے؟'' وحید نے جواب دیا۔ ''بالکل ٹھیک

ٹھاک! اپنی سناؤ؟'' خالد نے کہا تو وحید نے کہا کہ ''یار ذرا جلدی میں ہوں۔'' ''خیر باشد! گھر میں خیریت تو ہے؟'' ''ہاں! سب خیریت ہے۔ اصل میں اس وقت میرا پسندیدہ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔'' وحید نے کہا۔ خالد بولا۔ ''چھوڑو یار، پروگرام کے شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ ہے۔ آؤ ٹھنڈا پیتے ہیں۔'' دونوں اکرم صاحب کی دکان میں داخل ہوتے ہیں۔

خالد نے دوبارہ بحث چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''یار وحید، یہ پروگرام وغیرہ کوئی ہمارے نصاب کا حصہ تو نہیں ہے؟ یعنی تم اتنی اہمیت کیوں دیتے ہو؟'' ''ہاں! نصاب کا حصہ تو نہیں مگر اس سے ہمیں مختلف ملکوں کی سیر کرنے، غیر ملکی ثقافتوں سے آشنا ہونے، مختلف معلوماتی پروگراموں سے گوناگوں اور بھی چیزوں سے آشنا ہونے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔'' وحید نے خاصی تفصیل سے کہا۔ یہ عصر حاضر کی ایک ساحری ہے۔ جو ہمارا قیمتی وقت ضائع کرتی ہے۔ اسی دوران دکان دار اکرم صاحب بھی گاہکوں سے فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''نہیں دوست ایسا نہیں، مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں۔ یہ عصر حاضر کی ایک معجزہ نما ایجاد ہے جو ہماری سمعی اور بصری ذوق کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔'' وحید نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں ٹی وی کے پروگرام نہ صرف طالب علم کی توجہ ہٹا دیتے ہیں بلکہ صحت پر بھی منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان سے نکلنے والی تیز شعاعیں آنکھوں اور جلد کے سرطان کا باعث بن سکتی ہے۔'' خالد بھی برابر کا جواب دیتا رہا۔ ''یار تم ڈاکٹر کب سے بن گئے؟ ابھی تو تم نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔'' وحید بولا۔ اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ ''میں ڈاکٹر تو نہیں، تاہم اخباروں اور رسالوں میں ڈاکٹروں کی آراء تو پڑھتا رہتا ہوں۔'' محمد اکرم صاحب بھی بول پڑے۔ ''میرے بچو! کیا بات ہے؟ دونوں میں بحث چل رہی ہے۔'' اس کا سننا تھا کہ دونوں نے اپنی اپنی رائے محمد اکرم صاحب کی گوش گزارش کر دی۔ اکرم صاحب بولے۔ ''سنو بچو، کبھی کبھار اگر کوئی اچھا سا پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہو یا کوئی میچ ہو تو ٹی وی کے سامنے بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن جو طالب علم سارا دن فیس بک اور انٹرنیٹ پر گزارے گا، ان کی پڑھائی کا کیا حال ہوگا؟'' یہ سن کر خالد اور وحید دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بچو! ہمارا دین بھی ہمیں میانہ روی کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھار ٹی وی پر ایمان افروز پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جس طرح تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، اسی طرح ٹی وی بھی فائدے اور نقصانات رکھتا ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے کیسے استعمال کرتے ہیں۔'' اکرم صاحب نے بات بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''دیکھو! یہ ٹی وی اور موبائل بھی مغرب کی ایجاد ہے، تاہم دنیا میں اب بھی سب سے زیادہ کتابیں مغربی دنیا میں ہی چھپتی ہیں اور لوگ اسے پڑھتے ہیں۔ تعلیم کی شرح بھی وہاں زیادہ ہے۔'' اکرم صاحب پھر بولے۔ ''اس لیے میرے بچو، ایک باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرو۔ اس میں ہر کام مثلاً اسکول کا کام، گھر کے لیے سودا لانا، ورزش، نماز، قرآن کی تلاوت وغیرہ۔ ہر کام میں میانہ روی اختیار کرو۔'' خالد اور وحید پر ان باتوں کا گہرا اثر ہوا۔ خالد اور وحید دکان سے نکلے، ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اکرم صاحب کی باتوں پر عمل کا عہد دل میں لیے چلتے بنے۔ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

غصے پر قابو

(آمنہ مظہر، لاہور)

''امجد یہ تم نے کیا کیا؟ تم ایک کام بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتے۔'' علی نے غصہ میں امجد سے کہا۔ علی ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سب سے جھگڑا کرتا ہے۔ آج صبح بھی جب اسے کھانے میں اس کی پسند کا ناشتہ نہ ملا تو اس نے اپنی امی سے لڑائی کی اور اسکول میں جب اس نے امجد کو اپنے قلم میں روشنائی بھرنے کو کہا تو غلطی سے امجد کے ہاتھ سے روشنائی اس کی کتاب پر گر گئی۔ اسی وجہ سے علی نے اسے بہت ڈانٹا۔ امجد اور علی آٹھویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ دونوں بہت ہی پرانے اور اچھے دوست ہیں۔ امجد ہمیشہ علی کے ساتھ ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ علی کو بھی امجد بہت اچھا لگتا ہے مگر علی میں ایک عیب تھا کہ وہ اپنے غصے پر کبھی بھی قابو نہ رکھ پاتا۔ اس کے والدین، دادا جی اور اس کا دوست امجد اسے ہمیشہ سمجھاتے کہ غصہ کرنا بہت بری بات ہے۔ ہمیں ہمیشہ اپنے غصے کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ آج جب علی اسکول سے واپس آیا تو بہت غصے میں تھا۔ اس نے غصے میں آ کر ایک گلدان توڑ دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ گھر میں اس وقت دادا جان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس لیے اس گلدان کو کسی نے صاف نہ کیا۔ علی

جب اپنا ہاتھ منہ دھو کر نیچے کھانا کھانے آیا تو اس نے گلدان کی طرف نہ دیکھا اور بے دھیانی میں کھانے کی میز کی جانب دوڑا تو گلدان کے ٹکڑے اس کے اپنے پاؤں میں بہت زور سے لگے۔ اسے بہت تکلیف ہوئی۔ علی وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ دادا جان نے جب رونے کی آواز سنی تو بھاگتے ہوئے آئے اور دیکھا کہ علی کے پاؤں میں گلدان کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے چبھے ہوئے ہیں اور بہت زیادہ خون بھی نکل رہا ہے۔ دادا جان فوراً دوائی کا ڈبہ لائے اور اس کا زخم صاف کر کے دوا لگائی۔ جب دادا جان نے پوچھا۔ ''علی بیٹا! یہ گلدان کیسے ٹوٹا اور آپ کے پاؤں میں کیسے لگا؟'' تو علی نے بتایا: ''دادا جان! جب میں اسکول سے آیا تو میں نے غصے میں یہ گلدان توڑ دیا اور جب میں کھانا کھانے کے لیے دوڑتا ہوا نیچے آیا تو یہ ٹکڑے میرے پاؤں میں لگ گئے۔ یہ سب ان نوکروں کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ یہ سب صاف کر دیتے تو مجھے نہ لگتے۔ مجھے ان پر بہت زیادہ غصہ آ رہا ہے۔ آج میں ان لوگوں کو بالکل نہیں چھوڑوں گا۔'' دادا جان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا: ''علی! یہ سب آپ کی اپنی وجہ سے ہوا ہے۔ اس میں ان نوکروں کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے غصے پر قابو پا لیتے تو نہ ہی وہ گلدان ٹوٹتا اور نہ ہی آپ کے پاؤں میں لگتا۔ غلطی آپ ہی کی ہے۔ علی بیٹا! میں نے آپ کو کتنی مرتبہ بتایا ہے کہ اپنے غصے پر قابو رکھیں نہ کہ غصہ آپ کو اپنے قابو میں۔ بیٹا غصے کو قابو میں رکھنے سے ہم اپنی ساری پریشانیوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ: 'پہلوان وہی ہے جو اپنے غصے پر قابو رکھے نہ کہ دوسروں کو پچھاڑ دے۔' ہمیں چاہیے کہ ان کے فرمان پر عمل کریں۔ غصے کا سب سے زیادہ نقصان ہمیں ہی ہوتا ہے۔'' علی نے وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے غصے پر ہمیشہ قابو رکھے گا اور دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے گا۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

سبق

(محمد عاکف ایاز جتوئی، گوجرانوالہ)

فیصل پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ وہ بہت ذہین، فرماں بردار اور دانا بچہ تھا۔ اس کی سوچ قابلِ تحسین تھی۔ ایک دن اس کے ابو کے چند دوست ان کے گھر آئے تو اس وقت وہ اپنے ابو کے پاس بیٹھا تھا اور انگلش گرامر کی مشق کر رہا تھا۔ اس کے ابو اس سے tenses کا ٹیسٹ لے رہے تھے۔ ان کے دوستوں نے جب فیصل کو فر فر انگلش بولتے سنا تو حیران رہ گئے۔ ان میں سے ایک کہنے لگا: ''توقیر یار! آپ کا بیٹا تو بہت بڑی پوسٹ پر جائے گا۔ کیا بننا چاہتے ہو بیٹا؟'' ''انکل جی! مجھے اس بات کا تو پتا نہیں کہ اس پوسٹ کا نام کیا ہے، ہاں! اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسانیت کی خدمت کے کسی بڑے عہدے پر فائز ہونا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا انسان بننا چاہتا ہوں کہ جسے دیکھ کر ہر بھٹکے ہوئے شخص کو انسانیت یاد آ جائے۔'' ''ماشاء اللہ!'' وہ فیصل کی بات سن کر کہنے لگے۔

ابو نے ان کی خاطر تواضع کے بعد پوچھا۔ ''کیسے آنا ہوا؟ پیارے دوستو!'' انہوں نے کہا۔ ''توقیر صاحب! بات یہ ہے کہ ہمارا ہمسایہ اپنا گھر بیچنا چاہتا ہے۔ پچھلے دنوں آپ مجھ سے گھر کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ دیکھ لیں، پسند آ گیا تو مناسب قیمت میں خرید لیں گے۔'' ''چلو ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔'' ابو ان کے ساتھ ہو لیے تو اس انکل نے فیصل کو بھی ساتھ آنے کو کہا۔ جب وہ تہہ خانہ دیکھ رہے تھے تو انکل نے اونچی آواز میں قہقہہ لگایا۔

تہہ خانہ چوں کہ پیچھے سے بند تھا۔ اس لیے آواز ٹکرا کر واپس پلٹی۔ انکل نے فیصل کا امتحان لینے کے لیے ایک بار پھر سوال کیا۔ ''بیٹا! یہ آواز واپس کیوں پلٹی۔'' فیصل نے جواب دیا۔ ''انکل اس کے دو جواب ہیں۔'' ''کیا؟'' انکل نے حیرانی سے پوچھا۔

''پہلا جواب یہ ہے کہ یہ آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس پلٹی ہے کیوں کہ اس کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''شاباش اور دوسرا جواب؟''

''انکل دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر تخلیق میں ایک سبق پوشیدہ رکھا ہے۔ کائنات میں کوئی چیز نکمی نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جیسا سلوک کرو گے اللہ ویسا اجر دے گا۔ آپ اس تہہ خانے پر ہنسے تو یہ آپ پر ہنسا۔''

فیصل نے اونچی آواز میں کہا۔ ''تم بہت اچھے ہو۔'' آواز پلٹ کر آئی۔ ''تم بہت اچھے ہو۔'' پھر فیصل نے کہا: ''خدا تجھے سلامت رکھے۔'' آواز آئی۔ ''خدا تجھے سلامت رکھے۔'' ''پیارے انکل! اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اچھے انداز سے بات کریں گے تو اچھا صلہ ملے گا برے سے تو برا۔'' انکل نے فیصل کو پیار سے تھپکی دی اور کہا: ''سچ کہتے ہیں دانائی عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔''

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

دسویں صدی عیسوی میں سلطنتِ عباسیہ کا زوال شروع ہوا۔ اس کے دارالخلافے اور دیگر کئی علاقوں میں آزاد ریاستیں قائم ہونے لگیں۔ اسی دوران خراسان کی فوجوں کے سالار الپتگین، جو ایک ترک غلام تھے، نے بھی بغاوت کی اور 962ء میں آزاد ریاست کے طور پر ''غزنہ'' کی بنیاد رکھی۔ 963ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا ابو اسحٰق ابراہیم حکمران ہوا۔ اس کے بعد حکمرانی الپتگین کے غلام سبکتگین کے حصے میں آئی۔ 997ء میں سبکتگین کی وفات ہوئی تو اس کے بڑے بیٹے محمود کو حکومت ملی۔ اس وقت اس کی عمر محض 27 سال تھی اور اس وقت اس کے پاس صرف غزنی کی حکومت تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ خراسان پر بھی قبضہ کر چکا تھا۔ اس موقع پر عباسی خلیفہ القادر باللہ نے انہیں غزنہ اور خراسان کا والی تسلیم کیا۔

محمود غزنوی کے والد سبکتگین کے دور سے پنجاب کا راجہ جے پال دو بار شکست کھانے کے بعد باقاعدہ خراج ادا کر رہا تھا، مگر سبکتگین کے انتقال کے بعد اس نے نہ صرف خراج بند کر دیا بلکہ وہ غزنہ پر حملے کا منصوبہ بنانے لگا اور ابتدائی طور پر غزنہ کے ماتحت شہر پشاور پر حملہ کر دیا۔ محمود غزنوی نے جوابی حملہ کیا اور ایک بار پھر جے پال کو شکست ہوئی اور وہ محمود غزنوی کا قیدی بن گیا۔ محمود غزنوی نے اسے آٹھ ماہ بعد اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ آئندہ بغاوت نہیں کرے گا۔ واپس آ کر اس نے خودکشی کر لی۔

محمود غزنوی نے درۂ خیبر کے مشرق یعنی برصغیر پر سترہ حملے کیے۔ اس نے پہلا حملہ 1000ء میں کیا۔ اس کا بڑا حملہ قرامطیوں کے خلاف تھا جو مسلمان بستیوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ محمود کے حملے کے بعد اس کا سردار تو فرار ہو گیا مگر فوج قلعہ بند ہو گئی۔ سات روز کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح ہوا۔ اس کے بعد ملتان براہ راست غزنی حکومت کا حصہ بن گیا۔ یہاں محمد بن قاسم کے دور کی ایک مسجد بھی تھی جسے قرامطیوں نے بند کرا دیا تھا۔ محمود غزنوی کے حکم سے اس مسجد کو دوبارہ کھولا گیا۔

محمود غزنوی جب کسی جنگ کے لیے روانہ ہوتا تو میدان جنگ میں خیمے لگنے کے بعد وہ مقابلے سے پہلے والی رات عبادت میں بسر کرتا تھا اور اللہ سے کام یابی کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا۔ اسے سخت سردی میں گرم پانی نہیں ملا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے ہی وضو کیا۔ ایک بار خادم نے کہا۔ ''حضور! صبح جنگ ہونی ہے، آج کی رات تو آپ آرام کر لیجیے۔'' فرمایا: ''میرا کام آج کی رات ہی تو ہے۔ کل کا

کام اللہ کا ہے۔" وہ دعا میں اللہ سے فریاد کرتے کہ الٰہی ہم دو فریقوں میں جو تیرے بندوں کے حق میں بہتر ہو، اسے فتح عطا فرما۔"

محمود غزنوی نے ہمیشہ ان راجوں مہاراجوں کے ساتھ جنگ کی جنہوں نے مخلوق خدا کے لیے زمین تنگ کر دی تھی۔ وہ حافظ قرآن تھے۔ انہیں علم حدیث سے بھی بے حد محبت اور رغبت تھی۔ حدیث سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ رات کے وقت علمائے کرام کے ساتھ ان کی نشست ہوتی۔ علمائے کرام احادیث بیان کرتے جاتے اور وہ پوری توجہ سے سنتے۔

فارسی شاعری کو بھی فروغ دینے میں محمود غزنوی پیش پیش رہے۔ ان کے دربار سے چار سو فارسی شعراء وابستہ تھے۔ ان کی علم دوستی کا یہ نتیجہ نکلا کہ دور و نزدیک سے علم و فن سے وابستہ افراد غزنی میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ محمود غزنوی ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق وہ ہر سال علماء اور شعراء کی حوصلہ افزائی کے لیے چار لاکھ دینار خرچ کیا کرتے تھے۔

محمود غزنوی کے عہد میں ممتاز محدث احمد بن حسین بیہقیؒ نے قابل قدر علمی کام کیا۔ ایک اور مؤرخ ابن خواک نے تاریخ یمینی لکھی جس میں سبکتگین اور محمود غزنوی کے حالات نہایت احتیاط کے ساتھ درج ہیں۔

محمود غزنوی کے دربار سے ایک اور اہم شخصیت بھی وابستہ تھی۔ وہ مسلمان سائنس دان، سیاح، فلسفہ اور ریاضی سمیت کئی علوم کے ماہر ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی تھے۔ محمود غزنوی ان کی بے حد قدر کیا کرتے تھے۔ البیرونی نے یہاں آ کر سنسکرت زبان سیکھی اور عربی سے سنسکرت اور سنسکرت سے عربی زبان میں نہایت قیمتی کتب کے ترجمے کیے۔ ان میں کتاب الہند اور آثار الباقیہ مشہور ہیں۔ یہ کتب تاریخی معلومات کا گراں قدر خزانہ ہیں۔ انہوں نے غزنی میں ایک رصدگاہ بھی قائم کی۔

اس کے علاوہ فارسی زبان کا لازوال شاعر فردوسی بھی انہی کے دربار سے وابستہ تھا۔ فردوسی کی شہرۂ آفاق نظم "شاہنامہ" فارسی ادب کا خزانہ ہے۔ اس میں جنگوں کی تفصیل ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ہزار سال قبل جنگی آلات کی صورت حال کیا تھی۔ محمود غزنوی نے اس عظیم شاعر کی ہر ممکن سرپرستی کی۔

محمود غزنوی کے دور میں ہی لاہور علم و ادب کا گہوارہ بنا۔ اس کے علاوہ غزنی میں بھی ایک بڑی یونیورسٹی قائم ہوئی، جس کے ساتھ ہی ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں دنیا بھر سے نایاب کتب جمع کی گئی تھیں۔ اس یونیورسٹی میں ایک عجائب گھر بھی تھا جہاں دنیا بھر کی نادر و نایاب اشیاء کا بڑا ذخیرہ تھا۔ محمود غزنوی کی علم پروری کا یہ عالم تھا کہ وہ جو بھی شہر فتح کرتا، وہاں کی علمی کتابیں اکٹھی کر کے غزنی لے آتا اور اس شہر کے عالموں اور ماہرین کو بھی غزنی چلنے کی دعوت دیتا۔

اس کے علاوہ غزنی میں مساجد اور دیگر خوب صورت عمارتوں کا حسن جھلکتا تھا۔ ایک انگریز مؤرخ کے بقول پوری خلافت عباسیہ میں کوئی شہر غزنی کی عمارتوں کی شان و شوکت جیسا نہیں تھا۔ عدل و انصاف کا بول بالا رکھنے کے لیے محمود غزنوی نے ہر شہر میں قاضی مقرر کیے تھے جو اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

محمود غزنوی کی سب سے بڑی فتح، سومنات کی فتح ہے، اسے سومنات کا فاتح بھی کہا جاتا ہے۔ محمود غزنوی کو اطلاعات تو مل رہی تھیں کہ گجرات اور کاٹھیاوار میں ہندو، عرب تاجروں کے جہاز لوٹ لیتے ہیں اور گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ وہیں قریب مسلمان تاجروں کی بستی تھی جہاں ایک متقی بزرگ محمد بن حسن عراقیؒ رہتے تھے، ان سے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور انہوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا کہ وہ آ کر مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔

محمود غزنوی ملتان سے ہوتا ہوا صحرا عبور کر کے طویل سفر کے بعد سومنات پہنچے۔ فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تیروں کی بارش میں بھی مسلمانوں نے ہمت نہ ہاری اور فصیل پر چڑھ کر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس موقع پر ہندو پجاریوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر مندر میں جاتے اور بے جان بت کے سامنے گڑگڑاتے کہ ہماری مدد کرو۔ وہ بھلا مٹی کے بنائے ہوئے بت کیا کر سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہاں اسلامی پرچم لہرا رہا تھا اور ہندوؤں کو قیدی بنایا جا رہا تھا۔

یہاں تاریخی طور پر محمود غزنوی کے اس حملے کو دولت کا حصول قرار دیا جاتا ہے جو کہ سراسر غلط ہے کیوں کہ سومنات کے بت کو نہ توڑنے کے عوض انہیں بڑی رقم کی پیش کش کی گئی تھی جسے انہوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں بت شکن (بتوں کو توڑنے والا) ہوں، بت فروش (بت بیچنے والا) نہیں ہوں۔☆☆☆

باجی (ننھی سے): ''تم آنکھیں بند کر کے مٹھائی کیوں کھا رہی ہو؟''
ننھی: ''اس لیے کہ امی نے مٹھائی کی طرف دیکھنے سے منع کیا ہے۔''
(جانیتا اعظم، لاہور)

ڈاکٹر (مریض سے): ''اب آپ خطرے سے باہر ہیں، پھر بھی آپ اتنا کیوں ڈر رہے ہیں؟''
مریض (بے چارگی سے): ''جس ٹرک سے میرا ایکسیڈنٹ ہوا اس کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔''زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''
(ابرارالحق، راجہ جنگ)

ایک بے وقوف (اپنے دوست سے): ''کسی نے میری بھینس چرا لی ہے، مگر اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''
دوست: ''وہ کیوں؟''
''اس لیے کہ آج صبح ہی میں نے اس کا دودھ نکال لیا تھا۔''

☆

اُستاد (شاگرد سے): ''تم جغرافیہ یاد کر کے آئے ہو؟''
شاگرد: ''نہیں جناب!''
اُستاد (غصے سے): ''کیوں؟''
شاگرد: ''کل جلسے میں ایک سیاسی رہنما کہہ رہے تھے کہ ہم جلدی ہی دُنیا کا نقشہ بدل دیں گے، میں نے سوچا کہ میں نیا جغرافیہ ہی یاد کر لوں گا۔''
(ایمن اعجاز، صوابی)

ایک ڈاکٹر نے دیہاتی کی میڈیکل رپورٹ دیکھ کر اسے بتایا: ''تمہارا ایک گردہ فیل ہو گیا ہے۔'' دیہاتی بہت رویا۔ کچھ سکون آنے پر ڈاکٹر سے پوچھا: ''کتنے نمبروں سے؟''
(ابوبکر صدیق، فیصل آباد)

ایک پاگل نے دوسرے سے کہا: ''لوگ ہمیں پاگل کیوں کہتے ہیں؟''
دوسرے پاگل نے جواب دیا: ''لوگوں کو دفع کر، یہ لے لیموں، لسی بنا۔''
(عیشہ فاطمہ، فیصل آباد)

ماں (بیٹے سے): ''بیٹا کیا کر رہے ہو؟''
بیٹا: ''امی میں اپنے دوست کو خط لکھ رہا ہوں۔''
ماں: ''تم کو لکھنا کب آتا ہے؟''
بیٹا: ''تو میرے دوست کو پڑھنا کون سا آتا ہے۔''

☆

جج (ملزم سے): ''تم نے سنار کی دُکان سے زیورات کیوں چوری کیے؟''
ملزم: ''جناب! لکھا تھا سنہری موقع سے فائدہ اُٹھایئے۔''
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

پولیس: ''تمہیں کل صبح پانچ بجے پھانسی دی جائے گی۔''
سردار: ''ہا...... ہا...... ہا......''
پولیس: ''ہنس کیوں رہے ہو؟''
سردار: ''میں تو اُٹھتا ہی صبح نو بجے ہوں۔''
(زہرا شاہد، سرگودھا)

احمد (احسن سے): ''یہ کتاب بہت دل چسپ ہے۔ تم نے کتنے کی لی؟''
احسن: ''جس وقت میں نے یہ لی تھی، اس وقت دُکان دار، دُکان پر نہیں تھا۔''
(حرا سعید، جوہر آباد)

ماں (منے سے): ''اتنی سخت گرمی میں اتنے زیادہ کپڑے پہن کر کیوں جا رہے ہو؟''
منا: ''امی میں نے رات کو بتایا نہیں تھا کہ آج ہمارا اسکول میں وزن ہونا ہے۔''
(مہک خالد شیخ)

ایک بوڑھا (ڈاکٹر سے): ''جناب! میں رات بھر جاڑے سے کانپتا رہا ہوں، بخار بھی ہو گیا ہے۔''
ڈاکٹر: ''کیا دانت بھی بجتے رہے ہیں؟''
بوڑھا: ''بجتے رہے ہوں گے، مجھے پتا نہیں چلا کیوں کہ وہ تو میں نے اُتار کر الماری میں رکھ دیے تھے۔''
(عائشہ خالد شیخ)

سردار اپنے سولہ بچوں کے ساتھ دوست کے گھر کھانے پر گیا تو دوست نے اتنا بڑا خاندان دیکھ کر کہا۔''حیا نہیں آئی۔''
سردار: ''نہیں، اس کا پیپر ہے۔''
(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

ایک شخص اچھے سے اچھے شاعر کا کلام اتنے بُرے طریقے سے گاتا کہ سب توبہ توبہ کرتے۔ ایک دفعہ ایک مشاعرے میں وہ شخص موجود تھا اور احمد فراز سے مخاطب ہو کر بولا میں اب صرف زندہ لوگوں (شاعروں) کا کلام گاتا ہوں، جس پر احمد فراز نے جواب دیا کہ ظاہری بات ہے کہ مردے بے چاروں کو کیا مارنا!
(اسامہ ظفر راجہ، ایم سی ایم)

☆☆☆

فقر کے کوچے میں قدرِ دولت دُنیا نہیں
ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے پتھر سینکڑوں
(حرا سعید، جوہر آباد)

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
(مریم منیر، چونیاں)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
☆
بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
(مریم خالد، گوجرانوالہ)

گم صم ہوا آواز کا دریا تھا جو اک شخص
پتھر بھی نہیں اب وہ ستارہ تھا جو اک شخص
اب اس نے بھی اپنائے ہیں دُنیا کے قرینے
سائے کی رفاقت سے بھی ڈرتا تھا جو اک شخص
(ثروت یعقوب، لاہور)

سب زندہ رہنے کے بہت سے تھے مگر
ابھی سیر ہوئی تھی ابھی شام ہو گئی
(راؤ جاوید سحر، لاہور کینٹ)

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار !
☆

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
(عائشہ رحیم، شاہ کروٹ حیدر آباد)

نزع کی ہچکی کو ذرا غور سے سن
دمِ ہستی کا خلاصہ اس آہ میں ہے
(مومنہ عامر تجازی، لاہور)

ہے ترش رو میری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے، برہم میرے سوالوں سے
(محمد حمزہ سعید، بورے والا)

لہروں کا سکون تو سبھی کو پسند ہے لیکن
طوفانوں سے کشتی نکالنے کا مزا ہی کچھ اور ہے
(عائشہ خالد، لاہور)

میرے وطن میں محبت کی فضا مہکا دے
میرے مولا یہاں پہ امن و امان پھیلا دے
(نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ)

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں؟
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں؟
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟
(ایمان نور، لاہور)

نہ میں عجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

لوگ ہاتھ کی لکیروں میں دیکھتے ہیں مقدر اپنے
مقدر تو ان کے بھی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ نہیں ہوتے
(عبداللہ شاہ، دریا خان)

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ جون کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ سرورق بہت پیارا ہے۔ مجھے کہانی یتیم سے دُریتیم تک، ہمتوں کی داستان، تمہاری ہمت کو سلام، سنہرا خواب بہت پسند آئیں۔ خاص طور پر ناول چاندنی رات میں سانپ بہت ہی زبردست ہے اور ہاں! میں نے بلاعنوان اور کھوج لگایئے میں حصہ لیا ہے۔ پلیز! ضرور شائع کریں۔ (سلمیٰ محسن کلی، نوشہرہ)

میں تعلیم و تربیت کافی سالوں سے پڑھ رہی ہوں لیکن یہ میرا پہلا خط ہے۔ اُمید ہے آپ اسے ردّی کی نوکری سے دُور رکھیں گی۔ جون کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر تھا۔ خاص طور پر سنہرا خواب، والد کی دُکان، یتیم سے دریتیم تک اور ہمتوں کی داستان بہت پسند آئیں۔ سلسلہ آپ بھی لکھیے بہت اچھا ہے۔ نیا سلسلہ باہمت بچے بھی بہت پسند آیا۔ (نجی فاطمہ، لاہور)

☆ میگزین کی پسندیدگی کا بہت شکریہ!

السلام علیکم! مدیرہ صاحبہ! حال چال کیسے ہیں؟ میں تو بالکل خیر خیریت سے ہوں۔ تعلیم و تربیت آغاز تا آخر بلندیوں پر تھا اور بہت خوب صورت تھا۔ رمضان مبارک ہو۔ جب یہ خط شائع ہوگا تو رمضان کے آخری چار یا پانچ روزے رہتے ہوں گے۔ خاص نمبر خاص لوگوں کے لیے تھا اور خاص لوگوں کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنا۔ اللہ سب کو ہمت دے۔ یتیم سے دریتیم بھی اچھی تھی۔ ہمتوں کی داستان بھی خوب تھی۔ تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ تعلیم و تربیت سے مجھے وہ سیکھنے کا موقع ملتا ہے جو شاید نصاب کی کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔ ویسے بھی انسان ہر لمحہ ہی کچھ نہ کچھ سیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں سب سے کہتا ہوں کہ علم حاصل کرو اور آگے پھیلاؤ تاکہ اس ملک میں شعور بیدار ہو اور ہمارا ملک بھی ترقی کی منزلیں طے کرے۔ میری تمنا ہے کہ تعلیم و تربیت سفر میں آگے بڑھتا جائے اور ہمارا دماغ علم سے مالا مال ہوتا جائے۔ میں نے ایک نظم بھیجی ہے۔ میرے امتحان کے نتیجہ کے لیے دعا کیجیے گا۔ آپ یوں ہی اچھے کام کرتے رہیں اور اب اجازت دیں۔ (اسامہ ظفر اسامہ، مری)

☆ آپ کی کام یابی کے لیے دُعائیں۔ نظم کے لیے مزید کوشش کریں۔

سب سے پہلے میرا اسلام قبول کیجیے۔ پہلے خط لکھا شائع نہیں ہوا، آپ نے دل توڑ دیا ہم نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے بلاعنوان کے لیے ایک عنوان بھیجا، آپ نے شائع نہیں کیا۔ مجھے ناول چاندنی رات میں سانپ بہت پسند ہے، کیوں کہ اس میں جادوگروں کی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ میری ایک چھوٹی سی خواہش کیا آپ پوری کریں گے، وہ یہ ہے کہ آپ پریوں اور جادوگروں کی کہانیاں شائع کیا کریں۔ بس ہماری صرف یہی خواہش ہے۔ (حمیرا خاتون، کھورکوٹ)

☆ خط لکھنے کا بہت شکریہ! آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔

ڈیئر آپی، السلام علیکم! اُمید ہے کہ آپ اور آپ کی ٹیم بخیریت ہوگی۔ تعلیم و تربیت ایک عمدہ رسالہ ہے جو بچوں کی اخلاقی تربیت کر رہا ہے۔ اس ماہ کا رسالہ دیر سے ملا مگر جب ملا تو خوشی سے دل باغ باغ ہوگیا۔ میں ساتویں جماعت کی طالبہ اور تعلیم و تربیت کی قاری ہوں۔ میں نے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی ہے۔ (مبارک باد ضرور دیجیے گا) تمام لوگوں، بچوں، دوستوں کو رمضان مبارک ہو۔ اللہ ہمیں اس مبارک مہینے میں روزے رکھنے اور نیکیاں کمانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! (وردہ زہرہ سیال، جھنگ صدر)

☆ اوّل پوزیشن حاصل کرنے پر آپ کو مبارک ہو۔

دُعاؤں کی برسات کے ساتھ ہم حاضر خدمت ہیں۔ ہم اپنی ذاتی چیزیں دوسروں سے آرام سے شیئر کر لیتے ہیں لیکن اکثریت ذراتی بے تاں شیئر کرنے سے۔ لیکن ہم کیوں جلے ہوں کسی کے غم سے ہمیں تو اپنی کارگزاری سے مطلب ہے۔ کیوں کہ بے مطلب جو بھی چیزیں ہوں ہم ان پر دھیان نہیں دیتے ناں۔ آپ سے اپنی باتیں شیئر کر رہے ہیں۔ ویسے آج کل آپ کی طرف کیا چل رہا ہے۔ آج کل موسم ہماری طرف وہ رُخ لیے ہوئے ہے۔ کبھی گرمی، کبھی ہواؤں اور بادلوں کا گھیرا۔ بڑا ہی حسین امتزاج ہے۔ اللہ روزے اچھے گزارے۔ آپ کو رمضان کا پیارا اور بابرکت مہینہ مبارک ہو اور اپنا خیال رکھیے گا۔ اجازت دیجیے۔ بہت محبتوں کے ساتھ خدا حافظ۔ (نازیہ نرگی، نوشہرہ کینٹ)

☆ پیارا سا خط لکھنے کا شکریہ، آپ کو بھی رمضان مبارک ہو۔
کیا حال چال ہیں آپ کے؟ ہم اس قوم کے ہونہار بچے اور اس قوم کا روشن مستقبل ہیں۔ ہم نے بڑی خواہشوں اور اُمیدوں کو دل میں سجا کر آپ کو اپنے زندگی کے مقاصد سے آگاہ کیا ہے۔ آپ کی خدمت پر ہم مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ ہم دونوں بھائیوں کی تصویریں اکٹھی شائع کیجیے گا تاکہ کوئی فساد نہ ہو اور اس دُنیا کو ورلڈ وار تھری کا نظارہ نہ کرنا پڑے۔ ہمیں اُمید ہے آپ ہماری تشویش ناک حالت کو سمجھتے ہوئے مثالی ایڈیٹر کا کردار ادا کریں گی۔ (حماد حبیب، حارث حبیب)

☆ پیارے بچو! اتفاق میں برکت ہے۔ لڑنا جھگڑنا بُری بات ہے۔
تعلیم و تربیت کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ میں بہت سے رسائل کا مطالعہ کرتا تھا مگر آپ کا رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس مرتبہ بھی کھوج لگائیے کا جواب بھیج رہا ہوں۔ مہربانی کر کے ضرور شائع کریں۔ پاکستان کے قلعے کا سلسلہ شروع کریں۔ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ رمضان کے مہینے میں اللہ ہمیں تمام روزے رکھنے اور نمازیں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (محمد سلیم مغل، قصور)

☆ کھوج لگائیے میں انعام قرعہ اندازی سے نکلتا ہے۔ آپ کو انتظار کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔
اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ جون کا شمارہ زبردست تھا۔ ساری کہانیاں اچھی تھیں مگر مجھے ہمتوں کی داستان، یتیم سے ذریتیم سب سے زیادہ اچھی لگیں۔ کہانی والد کی دکان اعلیٰ تھی۔ محاورہ کہانی بہت دل چسپ تھی۔ اے حمید کا ناول چاندنی رات میں سانپ سنسنی خیز تھا۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ باہمت بچے آپ کی اچھی کاوش ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے، اس لیے ضرور شائع کیجیے گا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ آمین! (مریم چوہدری، ساہی وال)
اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے سال ہو گیا ہے اور میں دوسری دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ پلیز! میرے خط کو ردّی کی ٹوکری سے بچائیے اور میرے خط کو شائع کیجیے۔ اس شمارے میں ساری کہانیاں پُرلطف تھیں مگر ایک چیز کی کمی تھی اور وہ ہے آیئے مسکرایئے! میری خدا سے دعا ہے کہ تعلیم و تربیت ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ آمین! (محمد عثمان جاوید، واہ کینٹ)
میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو رمضان مبارک۔ تین بار میرا انعام نکلا مگر مجھے نہیں ملا۔ پلیز! جلدی بھیج دیں۔ میں بہت ایکسایٹڈ ہوں نئی نئی کتب کے لیے۔ خیر اب گلے شکوے ختم۔ خاص نمبر بہت ہی پسند آیا۔ حمد و نعت بھی بہترین تھے۔ آپ خط چھوٹے الفاظ میں لکھ دیا کریں تاکہ زیادہ لوگوں کے خط شائع ہو سکیں۔ کارٹون مووی کیسے بنتی ہیں؟ کچھ ان کے بارے میں بتائیں۔ آئندہ کے لیے اللہ حافظ۔ (طیب مقصود، فیصل آباد)

☆ آپ کی فرمائش جلد پوری کریں گے۔
ڈیئر ایڈیٹر صاحبہ! آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو رمضان کا مہینہ مبارک ہو۔ میں تعلیم و تربیت پچھلے دو سال سے پڑھ رہی ہوں مگر آپ کو خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کی ہے۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ کھٹ کھاند گروپ جیسے کوئی اور سلسلے شروع کریں۔ اُمید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی فرمائیں گی تاکہ میں یہ جرأت بار بار کر سکوں۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔
(خدیجہ خرم انصاری، لاہور)

☆ آپ تعلیم و تربیت کے دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیجیے۔
میری طرف سے تعلیم و تربیت کی تمام ٹیم کو بہت سلام۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں کافی سالوں سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا بہت شوق ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے کہانی کا پیٹرن بتا دیجیے۔ میں سلسلہ میری بیاض سے کچھ اشعار ارسال کر رہی ہوں، اگر پسند آئیں تو ضرور شائع کیجیے گا۔ اگر میرے خط لکھنے کا طریقہ غلط ہے تو مہربانی فرما کر میری اصلاح کر دیجیے گا۔ مجھے مایوس مت کیجیے گا، شکریہ!
(ایمان نور، لاہور)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

یمنہ کاشف، بہاول پور۔ منیزہ عظیم، گجرات۔ حمزہ عبداللہ، لاہور۔ منیبہ شہباز، لاہور۔ سیرا زاہد، کلورکوٹ۔ حفصہ فرقان، لاہور۔ عبدالرافع، لاہور۔ محمد رمیز بٹ، محمد حسن محمود، عبدالرافع احمد، مہک خالد شیخ، مریم اعجاز، ماہ نور بلوچ، لاہور۔ حرا سعید، جوہر آباد۔ ایوب، کراچی۔ شاہ زیب اثر، پشاور۔ ماریہ عبدالناصر، کلورکوٹ۔ علینا احمد، راولپنڈی۔ ثمرہ احمد بٹ، سیال کوٹ۔ ارفع اریج خان، اسلام آباد۔ ابوبکر جاوید۔ محمد زبیر جمشید، جہانیاں۔ ماہ نور بلوچ، لاہور۔ ابوبکر جاوید، لالہ موسیٰ۔ حرا سعید، جوہر آباد۔ احور کامران رانا، لاہور۔ بنین زہرہ، ساہی وال۔ درشہوار، ملتان۔ طیبہ کوثر، جھنگ۔ بشریٰ بتول، کوئٹہ۔ کظیمہ زہرہ، لاہور۔

آپ نے مداریوں کے بندروں کو قلابازیاں لگاتے دیکھا ہو گا۔ سرکس کے بندروں کو ماہر بازی گروں کی طرح تار یا رسّی پر چلتے یا سائیکل چلاتے بھی دیکھا ہو گا اور شاید اخبارات میں ایسے بندروں کی تصویریں بھی دیکھی ہوں گی جو موٹر گاڑیوں کو ایک ماہر ڈرائیور کی طرح چلا سکتے ہیں اور چلاتے بھی ہیں، مگر آج ہم آپ کو ایک ایسے بندر کا حال سناتے ہیں جو ایک عرصے تک ایک مصروف ترین ریلوے لائن پر کانٹا بدلنے والے کے اہم اور نازک ترین فرائض انجام دیتا رہا ہے۔

جی ہاں! کانٹے والا ریلوے کا ایک اہم ملازم سمجھا جاتا ہے اور اس کے فرائض نہایت اہم اور نازک ہوتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے آنے والی گاڑیوں کے لیے سبز، زرد اور سرخ جھنڈیوں اور روشنیوں کے اشارے دینا اور انہیں کانٹے بدل کر صحیح پٹڑیوں پر ڈالنا اس کے معمول کے فرائض ہیں اور ان معمول کے فرائض میں ذرا سی غفلت، ذرا سی بھول چوک سے ریل گاڑیاں حادثوں سے دوچار ہو سکتی ہیں۔

یہ کہانی 1877ء کی ہے جب کہ ایک حادثے میں جیمز وائلڈ نام کے ایک شخص کی ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد جیمز وائلڈ جنوبی افریقہ میں پورٹ الزبیتھ کے نزدیک واقع یوٹن ہیج اسٹیشن پر سگنل مین یعنی کانٹے والے کے طور پر ملازم ہو گیا تھا۔ اس اسٹیشن کی مصروفیت اور اہمیت کا اندازہ صرف ایک اس بات ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جنوبی افریقہ کی پانچ بڑی بندرگاہوں اور سونے اور ہیرے کی کانوں کے عین وسط میں واقع تھا۔

اس اسٹیشن کا سگنل ٹاور ریلوے لائنوں کے اس سلسلے کے ساتھ تھا جو شہروں کو قصبوں سے اور جنگلوں میں واقع چھوٹے چھوٹے دیہات سے ملاتا تھا۔ جیمز وائلڈ کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ مختلف سمتوں سے آنے والی گاڑیوں کو سبز، زرد اور سرخ سگنل دے کر اور کانٹے بدل کر انہیں صحیح منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی پٹڑیوں پر ڈالے۔ جیمز بے چارہ اسٹیشن کے قریب ایک کیبن میں تنہا رہتا تھا اور اسے نام کو بھی کوئی ایسا پڑوسی میسر نہیں تھا جس سے وہ گھڑی دو گھڑی باتیں کر سکے۔

1881ء کے موسم گرما کی ایک سہ پہر کی بات ہے کہ جیمز وائلڈ مقامی مارکیٹ میں کچھ خریداری کرنے گیا۔ اپنی وہیل چیئر چلاتے ہوئے وہ ایک مقامی باشندے کے قریب سے گزرا جو اپنے سامنے پنجروں میں مختلف پرندے اور جانور لیے بیٹھا تھا۔ ایک پنجرے سے اسے ایک بندر کا بچہ جھانکتا نظر آیا تو وہ رُک گیا۔ وہ

ایک لمحے تک اس بندر کی چیخیں سنتا رہا جو اسے بندر کی چیخوں کی بجائے ایک بچے کی کلکاریاں محسوس ہوتی تھیں۔ جیمز وائلڈ نے بندر کے اس بچے کو خرید لیا اور اس کے پنجرے کو لے کر اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔

کیبن میں آ کر اس نے بندر کے بچے کو پنجرے سے نکالا اور پنجرے کو چولہے میں ڈال دیا۔ اس نے اسے گرم گرم دودھ پلایا، اسے نہلایا اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں لے کر یوں تھپکنے لگا جیسے ایک ماں اپنے بچے کو لوریاں دیتے ہوئے سلانے کے لیے تھپکتی ہے۔ جب وہ سو گیا تو اس نے انتہائی نہایت آہستگی سے ایک نرم اور آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔

بندر کے اس بچے نے جیمز کی زندگی ہی بدل ڈالی۔ وہ اتنا خوش پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتا پلاتا تھا اور اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے اس کا نام جیک رکھ دیا۔ وہ پہروں جیک سے باتیں کرتا رہتا جو ہر گزرتے دن کے ساتھ ایک بندر کے بچے سے پورا بندر بنتا جا رہا تھا۔ اپنی ٹانگوں سے محرومی اب جیسے اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہی تھی۔ جیک نے اس کی زندگی سے اداسیوں، پریشانیوں اور محرومیوں کو نکال کر اسے خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں سے بھر دیا تھا۔

تاہم جیمز کو ایک پریشانی ضرور تھی۔ اس نے پہلے روز ہی جیک کا پنجرہ چولہے میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بندر جنگل کا باسی ہے، ہوسکتا ہے اس کا جی واپس جنگل میں جانے کو چاہتا ہو۔ اس صورت میں میرا اس کو کیبن میں بند کر کے رکھنا ایک طرح کا ظلم ہوگا۔ چناں چہ ایک روز جب وہ اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا اور اپنی وہیل چیئر چلاتا دوسری طرف دیوار کے قریب جا پہنچا۔

جیمز کی نظریں اب بندر پر جمی تھیں جو کھلے دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ چند لمحے وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ایک جمائی لی، اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جیمز کا دل جیسے اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ اب وہ منتظر تھا کہ دیکھیں جنگل کی آزاد زندگی اور جیمز کی دوستی اور قربت میں سے وہ کس کا انتخاب کرتا ہے۔

جیک نے دروازہ بند کر دیا اور آ کر جیمز کی گود میں لیٹ گیا اور پھر بڑے آرام سے سو گیا۔ جیمز کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا اب جیک ہمیشہ کے لیے اس کا دوست اور ساتھی تھا۔

جیسے جیسے جیک بڑا ہوتا گیا، وہ جیمز کا مختلف کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ کنوئیں سے پانی نکالتا اور پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے کیبن میں لاتا۔ جلد ہی وہ کیبن کے ساتھ والے باغ میں سبزیوں کی دیکھ بھال اور برتن وغیرہ دھونے کے کام بھی کرنے لگا۔ جیمز نے اس کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ یہ تنخواہ کیا تھی؟ ہفتے میں ایک ڈبا بسکٹوں کا اور دو چاکلیٹ۔ جیک کو ٹافیوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ ٹافی منہ میں ڈال کر وہ اسے دیر تک اپنے جبڑوں کے درمیان گھماتا اور کھلاتا رہتا تھا۔

سگنل ٹاور میں، جیک نے کئی طریقوں سے جیمز کی مدد کرنا شروع کی۔ وہ جھاڑو سے ساری جگہ کی صفائی کرتا اور کھڑکیوں کے شیشوں کو گیلے کپڑے سے صاف کرتا۔ دیوار کی ایک کھونٹی پر ایک خاص چابی لٹکی رہتی تھی۔ یہ چابی دُور جانے والی ریل گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو دی جاتی تھی۔ جب جیک گاڑی آنے کی آواز سنتا تو وہ کھونٹی سے چابی اتارتا اور ریلوے لائن کے قریب کھڑا ہو جاتا۔ ریل گاڑیاں سگنل ٹاور کے پاس سے گزرتے ہوئے آہستہ ہو جاتی ہیں۔ جیک لپک کر انجن پر چڑھ جاتا، ڈرائیور کو چابی تھماتا اور پھر چھلانگ لگا کر نیچے آ جاتا۔ ٹرین کی واپسی پر وہ اسی طرح چابی واپس حاصل کرتا اور اسے دوبارہ کھونٹی پر لٹکا دیتا۔

پھر جیک نے سگنل کی جھنڈیوں اور روشنیوں کا استعمال بھی سیکھ لیا۔ پھر تو یہ کیفیت ہوگئی کہ جیمز جس جھنڈی کا نام لیتا، جیک وہی جھنڈی اٹھاتا اور سگنل ٹاور کی کھڑکی سے لہرانے لگتا۔

پھر جیمز نے اس بندر کو کانٹا بدلنے کا کام سکھانے کا فیصلہ کیا۔ جیک کی روشن اور چمکتی ہوئی آنکھیں جیمز کو لمبے اور بھاری بھرکم لیوروں کے ذریعے ریل کی پٹڑیوں کے کانٹے بدلتے غور سے دیکھتی رہتی تھیں۔ جیمز نے ہر لیور کو ایک نمبر دے رکھا تھا۔ وہ ہر نمبر کو پہلے زبان سے کئی کئی بار دہراتا اور پھر اس نمبر کے لیور کو ہاتھ لگاتا۔ اس کام میں اسے ہر روز کئی کئی گھنٹے لگ جاتے مگر آخرکار اس کی محنت اور تربیت سے جیک اس قابل ہو گیا کہ ہر مرتبہ صحیح لیور کو کام میں لا سکے۔

جیمز اس بارے میں جیک کا ایک بار نہیں کئی کئی بار امتحان لیتا تھا۔ ہفتوں کی محنت اور تربیت کے بعد کہیں جا کر جیک اس قابل

ہوا کہ جیمز کے حسبِ منشا کانٹا بدلنے کا کام کر سکے۔ شروع شروع میں جیمز نے اس سے سست رفتار مال گاڑیوں کے کانٹے بدلوانے کا کام لیا اور جب جیک اس کام کو روانی، اعتماد اور درستی کے ساتھ کرنے لگا تو جیمز تیز رفتار گاڑیوں کے کانٹے بدلوانے کا کام بھی اس سے لینے لگا۔

جب کسی مسافر گاڑی کے کانٹا بدلنے کا وقت آتا تو جیمز کو یہ پریشانی ضرور ہوتی تھی کہ جیک کانٹا بدلنے میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے اوراس کی غلطی سے گاڑی کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ اگرچہ اسے جیک پر پورا اعتماد اور بھروسا تھا مگر یہ ایک بھاری ذمے داری تھی۔ ذرا سی غفلت سے مسافروں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے خاصے غور و فکر کے بعد جیک کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا۔

"جیک، سرخ جھنڈی!"

"زرد جھنڈی! تین نمبر کھینچو!"

جیمز کے ان احکام کی تعمیل جیک نے ایک ماہرانہ انداز میں کی۔

"سبز جھنڈی، جیک!"

جیک نے اس کے حکم کے مطابق سبز جھنڈی دکھائی اور مسافروں سے لدی پھندی گاڑی اپنی پٹڑی بدلنے کے بعد تیزی سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ پہلا موقع تھا جب جیک نے جیمز کے حکم کے مطابق کسی مسافر گاڑی کے لیے درست طور پر کانٹا بدلا اور گاڑی کسی حادثے سے محفوظ رہی۔ اس کے بعد جیک نے یہ کام سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ کیا اور ہر بار بالکل ٹھیک ٹھاک کیا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کام میں اتنا ماہر ہوگیا کہ جیمز کے سگنل ٹاور میں موجود نہ ہونے پر بھی سارے کام کو اپنے طور پر انجام دے سکتا تھا۔ جیمز اپنے کیبن میں آرام کر رہا ہوتا اور جیک سگنل ٹاور میں گاڑیوں کو سرخ، زرد اور سبز جھنڈیاں دکھا رہا ہوتا اور کانٹے بدل کر انہیں اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی پٹڑیوں پر ڈال رہا ہوتا۔

1881ء سے 1890ء تک پورے نو سال جیک، جیمز کا اس کام میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ پورے نو سال تک جیمز اور جیک کی یہ رفاقت قائم رہی اور اس وقت ختم ہوئی جب ایک موذی مرض کا شکار ہو کر جیک اس دُنیا سے رخصت ہوگیا۔

آج جیک اور جیمز دونوں میں سے کوئی بھی اس دُنیا میں نہیں۔ ریل گاڑیوں کے سفر میں بھی طرح طرح کی تبدیلیاں اور ترقیاں ہو چکی ہیں، مگر جنوبی افریقہ کی پانچ بڑی بندرگاہوں اور سونے اور ہیرے کی کانوں کے عین وسط میں واقع یوٹن ہیج ریلوے اسٹیشن کے لوگ اب بھی جیک نامی اس بندر کی کہانی بڑی دل چسپی سے کہتے اور سنتے ہیں جو اس مصروف ترین ریلوے لائن پر کانٹا بدلنے کے اہم اور نازک ترین کام کو بغیر کسی حادثے کے ایک نہ دو، پورے نو سال تک انجام دیتا رہا تھا۔ ☆☆☆

قدیم عرصہ سے بصرہ اپنی تجارت، قدیم روایات، کھجوروں اور علم وفضل کے لیے بہت مشہور رہا ہے مگر اس کی سب سے زیادہ دل چسپ اور مشہور چیز وہ ''قصہ گو'' ہیں جو سرِشام دیے جلتے ہی بصرہ کے بازار میں نکل آتے تھے اور کسی پیڑ کے نیچے یا کسی بند دُکان کے چبوترے پر کھڑے ہوکر نہایت دل نشین انداز میں کوئی نہ کوئی قصہ سنانا شروع کر دیتے۔ ان کا انداز، ان کا لہجہ اور ان کے الفاظ اس قدر دل موہ لینے والے ہوتے کہ چلتے قدم تھم جاتے۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے اور قصے سننے میں اس قدر محو ہو جاتے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ یہ قصہ گو بہت شاطر اور چالاک تھے۔ یہ ہر روز کہانی وہاں ختم کرتے جہاں لوگوں کا تجسس عروج پر ہوتا اور وہ کہانی کا انجام جاننے کے بارے میں بے تاب ہوتے مگر یہ قصہ گو، کہانی کا انجام دوسرے دن پر ٹال دیتے اور سننے والے دوسرے دن کے انتظار میں ان کو بطور نذرانہ، ہدیہ یا اجرت کچھ رقم دے کر چلے جاتے ۔ اسی رقم سے یہ قصہ گو اپنے گھر کا خرچ چلاتے، یہی ان کا روزگار تھا۔ اسی بصرہ شہر میں ایک ایسا ہی قصہ گو تھا جو لوگوں کو قصے کہانیاں سناتا سناتا خود ایک کہانی کا حصہ بن گیا۔

بصرہ شہر میں ایک قصہ گو رہا کرتا تھا جس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ بالکل چار یا پانچ سال کے بچے کے برابر، مگر اس کی زبان خوب چلتی تھی۔ اس کا دماغ بھی بہت تیز تھا۔ وہ ایسے ایسے دل چسپ قصے گھڑ کر لوگوں کو سناتا کہ سننے والے اس کے گرویدہ ہوکر رہ گئے۔ یہ شخص پورے بصرہ شہر میں اپنی کہانیوں، قصوں اور لطیفوں کے لیے مشہور تھا۔ لوگ ہر شام بازار میں اس کو ڈھونڈ کر خاص طور پر اس کے قصے سننے کے لیے آتے ۔ یہ لوگوں میں ''چھوٹا قصہ گو'' کے نام سے مشہور تھا۔

اس روز بھی لوگ چھوٹے قصہ گو اور دوسرے لوگوں کی کہانیاں سن کر شاداں و فرحاں اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ رات کا سناٹا ہر طرف چھانے لگا تھا۔ بازار بھی سنسان ہو رہا تھا۔ اس عالم میں بصرہ کا شاہی درزی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ دریا کے کنارے سیر و تفریح کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ جب اس کی گاڑی بازار میں سے گزری تو اس کی بیوی نے قصہ سننے کی فرمائش کی۔

''......مگر اس وقت تو سارے قصہ گو واپس جا چکے ہیں۔'' درزی نے اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی گاڑی آگے بڑھاتا اس کی نظر چھوٹے قصہ گو پر پڑی جو زیرِ لب کوئی گیت گنگناتا ایک طرف جا رہا تھا۔ درزی نے فوراً اس کو روک لیا اور کوئی قصہ سنانے کی فرمائش کی۔

''اب تو وقت گزر چکا ہے اور میں کھانا کھانے جا رہا ہوں کیونکہ مجھے تیز بھوک محسوس ہو رہی ہے۔'' چھوٹے قصہ گو نے

معذرت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں، وہاں ہم آپ سے قصہ بھی سن لیں گے اور آپ کو کھانا بھی کھلائیں گے۔ آج ہمارے گھر میں دریا کی تازہ مچھلی کا سالن بنا ہے۔" شاہی درزی نے تجویز پیش کی تو مچھلی کا ذکر سن کر قصہ گو کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے جھٹ سے ان کی دعوت قبول کر لی اور اپنی کہانی کے ساتھ ان کے گھر دعوت اُڑانے آ گیا۔ گھر پہنچ کر درزی نے قصہ گو کے سامنے تلی ہوئی مچھلی رکھی اور خود دونوں میاں بیوی قصہ سننے اس کے پاس بیٹھ گئے۔ قصہ گو نے ایک دل چسپ قصہ سنانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی بے تابی سے مچھلی کھانے لگا۔ اس کو بھوک نے بہت ستایا ہوا تھا، اس لیے وہ بڑے بڑے نوالے لے رہا تھا۔ ایک ایسے ہی نوالے کے ساتھ جب قصہ سناتے ہوئے وہ خود بھی ہنسا تو مچھلی کا ایک بڑا سا کانٹا اس کے حلق میں پھنس گیا جسے اس نے نگلنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ تو جیسے اپنی جگہ جم گیا تھا۔ اس کو سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ چہرہ لال ہو گیا اور آنکھیں باہر کو اُبل آئیں، پھر اس سے پہلے کہ کوئی اس کی کچھ مدد کرتا وہ اُلٹ کر پیچھے زمین پر گرا اور بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔

شاہی درزی اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو اسے قصہ گو کی سانس رُکی ہوئی محسوس ہوئی، اس نے سمجھا کہ چھوٹا قصہ گو مر گیا ہے۔ ہلا جلا کر دیکھا مگر جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ "ارے...... یہ ہم سے کیا ہو گیا۔ یہ آدمی ہمارے گھر بطور مہمان آیا تھا اور ہم نے اسے مار دیا۔ اب اس کے قتل کے جرم میں بادشاہ کے سپاہی مجھے گرفتار کر لیں گے، شہر میں میری عزت دو کوڑی کی بھی باقی نہیں رہے گی۔ میں تو بدنام ہو جاؤں گا۔" درزی کی بیوی بھی اس صورت حال پر بہت پریشان تھی۔ دونوں نے سر جوڑ کر مشورہ کیا کہ کسی طرح اس قصہ گو کی لاش سے چھٹکارا حاصل کریں ورنہ سارا الزام ان پر ہی آئے گا۔ انہوں نے ایک منصوبہ بنایا اور پھر قصہ گو کی لاش کو ایک پُرانے غالیچے میں لپیٹ دیا۔ اس غالیچے کو درزی نے اپنے کندھے پر اُٹھا لیا اور دونوں میاں بیوی گھر سے نکل آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس لاش کو کسی سنسان گلی میں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

بصرہ شہر کی گلیاں رات کے وقت سنسان اور تاریک ہو چکی تھیں۔ انہوں نے ایک تاریک گوشے کو مناسب جان کر جب وہاں اس لاش کو رکھنا چاہا تو اچانک ایک عورت وہاں آ گئی اور ان کے کندھے پر غالیچے کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ارے...... یہ کون ہے اور کیا ہوا اسے......؟"

"ہمارا بچہ بیمار ہے اور ہم کسی طبیب کی تلاش میں ہیں۔" درزی نے بنا سوچے سمجھے بہانہ بنا دیا۔ وہ عورت شاہی طبیب کی کنیز تھی اور اس وقت کسی کام سے باہر نکلی تھی۔ جب اس نے بیمار کا سنا تو اس نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بولی۔ "میرا آقا طبیب ہے میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ان کے پاس لے چلتی ہوں۔"

دونوں میاں بیوی غالیچے میں لپٹی قصہ گو کی لاش کندھے پر اُٹھائے اس کنیز کے پیچھے پیچھے چل پڑے جو ان کو لے کر ایک بڑے سے گھر کے باہر پہنچی جس کا دروازہ بہت اُونچا تھا۔ دروازے تک پہنچنے کے لیے اس کے سامنے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ کنیز نے ان کو وہیں باہر رکنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "میں اندر جا کر آقا کو مریض کا بتاتی ہوں۔ آپ یہیں انتظار کریں، جب وہ بلائیں تو پھر اندر آ جانا۔" یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ کنیز کے گھر کے اندر جاتے ہی درزی نے پھرتی دکھائی اور سب سے اُوپر والی سیڑھی پر دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ قصہ گو کی لاش کو کھڑا کر دیا اور خود اپنا غالیچہ لے کر وہاں سے بیوی سمیت رفو چکر ہو گیا۔

مریض کا سن کر طبیب عجلت میں باہر نکلا۔ گھر کا دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا جونہی اس نے دروازہ کھولا تو چوکھٹ کے ساتھ کھڑی لاش اس کے ٹکرانے کی وجہ سے لڑھکتی ہوئی نیچے گلی میں جا گری۔ طبیب دوڑ کر نیچے اُترا۔ دیکھا تو ایک لاش پڑی تھی وہ گھبرا گیا اور سر پیٹنے لگا۔ "اوہ...... یہ میں نے کیا کر دیا۔ ایک مریض میرے پاس علاج کروانے کے لیے آیا اور میں نے اسے مار دیا۔ لوگ اس بارے میں سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ جب بادشاہ کے سپاہی مجھے گرفتار کر کے لے جائیں گے تو میری ساری عزت مٹی میں مل جائے گی۔ اب میں کیا کروں؟"

طبیب اس لاش کو فوراً اُٹھا کر گھر کے اندر لے گیا اور سوچنے لگا کہ اس سے کیسے جان چھڑاؤں۔ سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس نے لاش کو اُٹھا کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے پڑوسی کے صحن میں پھینک دیا۔ اس کا پڑوسی بادشاہ کے باورچی خانے میں کھانا پکانے کا کام کرتا تھا۔ اس کے صحن میں آٹے کے تھیلے اور شکر کی بوریاں پڑی رہتی تھیں۔ چھوٹے قصہ گو کی لاش ان بوریوں کے اوپر جا گری۔ دھماکے کی آواز سن کر شاہی باورچی چوکنا ہو گیا۔ اسے خیال گزرا کہ شاید کوئی چور گھر میں گھس آیا

ہے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس نے ایک موٹا سا ڈنڈا سنبھالا اور دبے پاؤں صحن میں آ گیا۔ وہاں اسے قصہ گو کی لاش دکھائی دی تو وہ سمجھا شاید یہ کوئی چور ہے جو بوریوں پر جھکا ہوا ہے۔ غصے میں آ کر اس نے ڈنڈا پوری قوت سے اس کی کمر میں دے مارا۔ لاش زمین پر آ گری۔ باورچی نے جھک کر غور سے دیکھا تو لاش کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ سوچنے لگا۔ ''یہ مجھ سے کیا ہو گیا، شاید یہ غریب شخص کچھ آٹا شکر لینے میرے گھر آیا تھا اور میں نے اس کو مار دیا۔ اب اس قتل پر میرے ساتھ کیا ہو گا؟ شہر میں میری جو عزت بنی ہوئی ہے اس کا کیا ہو گا، لوگ کیا کہیں گے؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد شاہی باورچی نے اس لاش کو اُٹھایا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ بصرہ شہر کی گلیاں سنسان پڑی تھیں کیونکہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ تاریک اور سنسان گلیوں میں چلتا ہوا وہ نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ وہ اس لاش کو نہر میں پھینک دینا چاہتا تھا۔ جونہی وہ اس کو پانی میں پھینکنے لگا تو اس کو کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی شخص اپنی بے سری آواز میں گاتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ شاہی باورچی نے ڈر کے مارے لاش کو وہیں چھوڑا اور خود جس طرف سے آیا تھا، اسی طرف واپس بھاگ لیا۔

دوسری طرف وہ گاتا ہوا شخص جو ایک مہاجن تھا اور لوگوں کو سود پر قرضے دیتا تھا، لاش کو یوں راستے پر پڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ کوئی چور ہے جو اس کو لوٹنے کے لیے اس کا راستہ روکے پڑا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے قصہ گو کی لاش کو کندھے سے دبوچا اور اس کا سر زور زور سے زمین پر مارنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی شور مچا دیا۔ ''............ چور............ چور......''

اس کا شور سن کر قریب ہی موجود ایک چوکی دار فوراً لپک کر وہاں پہنچا اور دیکھا کہ مہاجن کسی کو دبوچے اس کا سر زمین پر پٹخ رہا ہے۔ چوکی دار نے چھوٹے قصہ گو کو پہچان لیا اور وہ چیخنے لگا۔

''تم سود خور مہاجن......! تم نے اس قصہ گو کو قتل کر دیا ہے۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔'' اور اس چوکی دار نے مہاجن کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن صبح سویرے بصرہ کے بازار کے باہر بے شمار لوگ جمع تھے۔ آج بادشاہ نے اپنا دربار اس جگہ لگایا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے سارے وزیر اور وزیرِ اعظم بھی موجود تھا۔ قریب ہی ایک چبوترے پر چھوٹے قصہ گو کی لاش پڑی تھی اور سامنے سود خور مہاجن زنجیروں میں جکڑا، سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تم سود خور مہاجن......!'' وزیرِ اعظم بولا۔ ''آج تم نے اس پُرامن شہر کی ان گلیوں میں ایک شخص کو بغیر کسی وجہ کے قتل کر دیا ہے۔ تم نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا ہے جو لوگوں میں خوشیاں بانٹتا تھا۔ بولو! اب تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟''

مہاجن بولا۔ ''حضور......! میں گناہ گار ہوں، آپ مجھے سزا دے سکتے ہیں۔ میں اپنے اس جرم پر سخت نادم ہوں۔''

بادشاہ کے حکم سے اس مہاجن کو پھانسی کے تختے تک لایا گیا اور پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ قریب تھا کہ جلاد رسی کھینچ کر اس کو پھانسی دے دیتا۔ ہجوم سے ایک آواز اُبھری۔ ''رُک جاؤ! رسی مت کھینچو۔ یہ شخص بے گناہ ہے، اسے آزاد کر دو۔ اصل مجرم میں ہوں، مجھے سزا دو۔'' پھر ہجوم سے نکل کر شاہی باورچی، بادشاہ کے سامنے آ گیا اور کہنے لگا۔

''بادشاہ سلامت اس قصہ گو کو میں نے قتل کیا ہے کیونکہ یہ میرے

گھر سے آتا اور شکر چوری کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے نہر کے کنارے چھوڑا تو یہ میرے ڈنڈے کے وار سے پہلے ہی مر چکا تھا۔"

"تم تو شاہی باورچی ہو اور تم پچھلے کئی برسوں سے شاہی باورچی خانے کے لیے کھانے کی چیزیں مہیا کر رہے ہو۔ تم نے ایک غریب آدمی کو قتل کر دیا۔ تمہیں اس جرم میں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔" وزیراعظم بولا۔ اب شاہی باورچی کو پھانسی گھاٹ پر لایا گیا اور مہاجن کی گردن سے پھندا نکال کر اس کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ وہ مرنے کو تیار تھا کہ اچانک ہجوم میں سے ایک اور چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ "بادشاہ سلامت! شاہی باورچی بے گناہ ہے، اسے چھوڑ دیں۔ میں مجرم ہوں، مجھے سزا دیں۔"

یہ آواز شاہی طبیب کی تھی۔ وہ ہجوم سے نکل کر آگے آیا اور کہنے لگا۔ "اس قصہ گو کا قتل میرے ہاتھوں ہوا ہے۔ یہ اس وقت مر چکا تھا جب میں نے اسے اپنے پڑوسی، شاہی باورچی کے صحن میں پھینکا تھا۔ میرے دروازے کی ٹھوکر لگنے سے یہ میرے گھر کی سیڑھیوں کے اُوپر سے گرا اور مر گیا۔"

"تم تو شاہی طبیب ہو۔" وزیر اعظم حیران ہو کر بولا۔ "تم نے کئی مواقع پر بادشاہ سلامت کا علاج کیا ہے۔ کیا تم نے اپنا ایک مریض مار دیا۔ اس جرم میں تمہیں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔"

یہ نیا حکم سن کر پھانسی دینے والے جلاد ایک بار پھر رُک گئے۔ اب شاہی طبیب کو پھانسی کے پھندے کے پاس لے جایا گیا اور شاہی باورچی کی گردن سے پھندا نکال کر طبیب کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ وزیر اعظم نے جلاد کو اشارہ کیا کہ رسّی کھینچ دو مگر اسی وقت ہجوم میں ایک بار پھر ہلچل مچی اور کوئی چیخا۔

"بادشاہ سلامت یہ شخص بھی بے گناہ ہے، اسے چھوڑ دیں اور مجھے سزا دیں۔ یہ جرم مجھ سے سرزد ہوا ہے۔" پھر لوگوں نے دیکھا کہ شاہی درزی ہجوم سے نکل کر سامنے آ گیا اور کہنے لگا۔

"بادشاہ سلامت اس قصہ گو کا قتل میرے ہاتھوں ہوا ہے۔ شاہی طبیب بالکل بے گناہ ہے۔ کل رات یہ چھوٹا قصہ گو ہمارے گھر آیا تا کہ مجھے اور میری بیوی کو کہانیاں سنا سکے۔ ہم نے اس کو کھانا کھلایا مگر مچھلی کا کانٹا اس کے گلے میں پھنس گیا جس کے چبھنے کی وجہ سے یہ مر گیا۔ یہ ہماری غلطی کی وجہ سے مرا ہے۔ ہم لوگ ہی اسے شاہی طبیب کے دروازے پر چھوڑ آئے تھے۔"

شاہی درزی کی ساری بات سن کر وزیر اعظم کہنے لگا۔ "تم تو وہی درزی ہو جو پچھلے کئی برسوں سے بادشاہ اور شاہی خاندان کے کپڑے سی رہے ہو مگر تم نے ایک جرم کیا ہے اور تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ تمہیں پھانسی کی سزا ملے گی۔" اب سپاہی درزی کو پکڑ کر پھانسی کے پھندے کے پاس لے گئے اور جلاد رسّی اس کے گلے میں ڈال کر کھینچنے کو تیار ہو گیا۔ سارے ہجوم پر سکوت طاری ہو گیا۔ آخر کار اصلی مجرم کو سزا ملنے والی تھی مگر پھر کوئی چیخا۔

"یہ بے گناہ ہے اسے آزاد کر دو۔"

"بس! اب بہت ہو گئی...... یہ دربار ہے کوئی کھیل تماشا نہیں۔ اب کون بولا ہے۔" بادشاہ غصے سے چلا اُٹھا۔ اس دفعہ جو بولا تھا وہ ایک عقل مند بوڑھا شخص تھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ وہ فقیر کی لاش کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ جھک کر ادب سے کہنے لگا۔

"بادشاہ سلامت! روکنے کی معافی چاہتا ہوں مگر اس چھوٹے قصہ گو کی موت میں ایک راز ہے۔"

"کیسا راز......؟" بادشاہ نے حیرت سے پوچھا تو عقل مند بوڑھا کہنے لگا۔ "بادشاہ سلامت! وہ راز یہ ہے کہ یہ چھوٹا قصہ گو مرا نہیں ہے بلکہ یہ زندہ ہے۔ دیکھیں یہ ابھی بھی سانس لے رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کندھے پر لٹکتے تھیلے سے لوہے کی بنی ایک لمبی چمٹی اور مرہم کا ایک برتن نکالا۔ تھوڑی سی مرہم لے کر اس نے چھوٹے قصہ گو کے گلے پر مالش کی اور پھر چمٹی اس کے منہ میں ڈال کر گلے میں پھنسا ہوا مچھلی کا کانٹا باہر کھینچ لیا۔ جونہی کانٹا باہر نکلا چھوٹا قصہ گو اپنی گردن مسلتا اور کھانستا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ سارے ہجوم میں شور مچ گیا۔ ہر کوئی حیران تھا۔ قصہ گو بادشاہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

بادشاہ سلامت میں کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ اس کا جس نے کانٹا پھنسنے کے بعد مجھے گھر سے باہر پھینک دیا۔ اس کا جس نے ٹھوکر مار کر مجھے سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیا۔ اس کا جس نے ڈنڈے سے میری کمر پر خوب زور سے ضرب لگائی۔ اس کا جس نے میرے سر کو زمین پر زور زور سے پٹخا یا اس کا جس نے کانٹے کو میرے گلے سے کھینچ نکالا اور مجھے ٹھیک کر دیا، مگر نہیں...... شکریہ اس خدا کا جس نے مجھے اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی نئی زندگی دی۔"

"میں نے اس سے زیادہ عجیب اور دل چسپ واقعہ پہلے کبھی نہیں سنا۔ اسے لکھو اور شاہی کتب خانے میں محفوظ کر دو۔" بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا۔ شاہی درزی کو بھی آزاد کر دیا گیا اور بادشاہ نے چھوٹے قصہ گو کو "شاہی قصہ گو" مقرر کر دیا اور وہ ہر روز شام کے بعد شاہی محل میں بادشاہ کو قصے سنانے پر مامور ہو گیا۔ یوں وہ لوگوں کو قصے سناتے سناتے خود ایک دل چسپ قصے کا حصہ بن گیا۔ ☆

بلا عنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ جولائی 2016ء ہے۔

جون 2016ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، ان میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، ان عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- خدا کا شکر ادا کر بھائی، جس نے ہماری گائے بنائی (مریم مصطفی، رحیم یار خان)
- نہیں ہے کوئی چیز نکمی زمانے میں، کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں (عفت سراج، ڈیرہ غازی خان)
- گائے کی دم، غریب کا برش (بریرہ عبداللہ، لاہور)
- پھٹک لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے (زوار قاسم، لاہور)
- ضرورت ایجاد کی ماں ہے (محمد حاشر، گوجرانوالہ)

طہٰ مختار، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

محمد زبیر جمشید، جہانیاں (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

طیب مقصود، فیصل آباد (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

مہرین مجاہد، ملتان (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

زہرا شاہد، سرگودھا (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی: محمد عثمان جاوید، واہ کینٹ۔ سعید تحریم مختار، لاہور۔ سطنت نعیم، مریم اسلم، مریم نثار، سمیرا مجاہد، ملتان۔ عزیر خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ فروا جمیل، لاہور۔ طیب مقصود، فیصل آباد۔ بشریٰ حسینی، کلور کوٹ۔ شبیر ناصر، گکھڑ۔ اسامہ ظفر راجہ، مری۔ زینب گل، اسلام آباد۔ عید فاطمہ، فیصل آباد۔ ایمن زاہد، اسلام آباد۔ شاہ زیب اثر، پشاور۔ حمیرا خاتون، بھکر۔ دافعہ یاسین، بھکر۔ محمد نعمان شریف، اوکاڑہ۔ حرمل بتول، لاہور۔ محمد احمد، پشاور۔ شبیر احمد، راولپنڈی۔ مرزا احسن، فیصل آباد۔ محمد احمد، لاہور۔ حما سعید، جوہر آباد۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ زہرا، اسلام آباد۔ سمیرہ زاہد، بھکر۔ سادیہ نعمان، لاہور۔ سعید توقیر، کراچی۔ رحیمہ شہزاد، گجرات۔ ایمن فاطمہ، ملتان۔ میاں عبدالمنان، لاہور۔ صبا بابر علی، کرن شہباز، ثنا، فدا حسین، محمد یوسف کامران، عمار عارف، بہادر، دلاور علی، محمد علی، تحسین اسحاق، لقمان سرور، محمد زوہیب، عروج مشتاق، زارا ماہجاہ، فاطمہ شاہ، فریحہ اقبال، عائشہ کنول، مدثر عباس، حرمل حمزہ خان، زینب نثار، شہباز علی، سحرش طارق، سلمان ساجد قریشی، عامر رفیق، نوبا قیم، ملتان۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 اگست

جولائی کا موضوع
بارش کا ایک دن

آخری تاریخ 8 جولائی